الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

لڑنے کے میدان میں وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں
جو اس سے پہلے
نہ لڑنے کے میدان میں کامیاب ہو چکے ہوں

شمارہ ۱۶۷ اکتوبر ۱۹۹۰

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ ۔ سورۃ بنی اسرائیل
جلد دوم : سورۃ الکہف ۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبینِ قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۲۵ روپیہ
جلد دوم ۱۲۵ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

الرسالہ

اردو، ہندی اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۶۷ اکتوبر ۱۹۹۰

فہرست

AL-RISALA (Urdu) Monthly
The Islamic Centre C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013, India
Telephone: 611128, 697333 □ Telex: 031-61758 FLSH IN ATT IC
Fax: 91-11-353318, 3312601
Annual Subscription: Inland Rs. 60 □ Abroad US $ 25 (Air Mail)

کم پر راضی ہونا

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تھے۔ آپ نے خواب میں دیکھا کہ آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ میں داخل ہوئے۔ آپ نے وہاں طواف اور سعی کیا۔ قربانی کی اور سر منڈایا۔ آپ نے یہ خواب اپنے اصحاب سے بیان کیا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ اللہ کی طرف سے عمرہ کی بشارت ہے۔ چنانچہ تقریباً پندرہ سو آدمی سفر کے لیے تیار ہو گیے۔ آپ ان کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے۔

آپ اور آپ کے اصحاب مکہ سے ۹ میل کے فاصلہ پر حدیبیہ پہنچے تھے کہ قریش نے آگے بڑھ کر آپ کو روک دیا۔ اور کہا کہ ہم آپ لوگوں کو مکہ میں داخل ہونے نہیں دیں گے۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان بات چیت شروع ہوئی۔ آخر کار یہ طے ہوا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم مع اصحاب مدینہ واپس چلے جائیں۔ البتہ اگلے سال وہ خاموشی کے ساتھ آکر عمرہ کر سکتے ہیں۔

اس معاہدہ کے مطابق آپ نے فیصلہ فرمایا کہ عمرہ نہ کریں اور حدیبیہ سے واپس ہو کر مدینہ چلے جائیں تاہم قربانی کے جانور آپ کے ساتھ موجود تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اگرچہ ہم طواف اور سعی نہیں کر سکے۔ تاہم قربانی اور حلق ہم کر سکتے ہیں۔ اٹھو، اپنے جانوروں کو ذبح کرو اور سر کے بال منڈالو (قوموا فانحروا ثم احلقوا)

یہ گویا کم پر راضی ہونا تھا۔ اگرچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خواب کی بنا پر لوگوں کو پورا یقین ہو گیا تھا کہ وہ مکہ میں داخل ہوں گے۔ طواف اور سعی کریں گے۔ اور پھر قربانی اور حلق کریں گے۔ مگر جب ایسے حالات سامنے آئے کہ طواف اور سعی بظاہر ناممکن ہو گیا۔ اور صرف قربانی اور حلق ممکن رہ گیا۔ تو انھوں نے مکہ میں داخلہ اور طواف اور سعی کا ارادہ چھوڑ دیا اور قربانی اور حلق پر راضی ہو گیے۔

یہی زندگی کا راز ہے۔ اس دنیا میں آدمی کو کم پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ اس کے بعد وہ زیادہ کو پاتا ہے۔ جو شخص پہلے مرحلہ میں کم پر راضی نہ ہو وہ نہ کم کو پاتا اور نہ زیادہ کو۔ اس کے حصہ میں جو چیز آتی ہے وہ صرف یہ کہ وہ نزاع چھیڑ کر غیر ضروری طور پر اپنے کو برباد کرتا رہے۔ اور جب برباد ہو کر نزاع کے قابل نہ رہے تو یہ کہہ کر اپنے دل کو تسکین دینے کی کوشش کرے کہ میں تو کامیابی کے عین قریب پہنچ گیا تھا مگر دشمنوں کی سازش نے مجھے ناکام بنا دیا۔

کم پر راضی ہونا بھی رسول اللہ ؐ کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔

عجیب فرق

نئی دہلی میں رانی جھانسی مارگ پر ہفت روزہ آرگنائزر اور پانچ جنیہ کے دفاتر قائم ہیں۔ ان کے ذمہ داروں نے کئی بار مجھ سے کہا کہ ہماری خواہش ہے کہ ہم اپنے یہاں ایک میٹنگ کریں اور آپ وہاں آکر ہمیں اپنے خیالات سے آگاہ کریں۔ آخر کار اس کے لیے، جولائی ۱۹۹۰ء کی تاریخ مقرر ہوئی۔ اس روز وہاں جاکر میں نے اسلام کے بارہ میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تقریر کی اور سوالات کے جوابات دیے۔

مسلم اخبارات نے اپنی خود ساختہ رپورٹنگ میں اس تقریر کو کچھ کا کچھ بنا دیا۔ مثال کے طور پر ایک مسلم ہفت روزہ نے اس کی جو رپورٹ چھاپی اس کا عنوان سنسنی خیز طور پر یہ تھا :

مولانا وحید الدین خان : مسلم دشمن طاقتوں کے ہاتھ کا کھلونا۔

مسلم اخبار کے نزدیک میری تقریر اس بات کا ثبوت تھی کہ میں مسلم دشمن طاقتوں کے ہاتھ کا کھلونا ہوں۔ مگر جن ہندو صاحبان کے درمیان میں نے وہ تقریر کی، ان کی نظر میں سارا معاملہ بالکل برعکس تھا۔

آرگنائزر کے ایڈیٹر مسٹر وی پی بھاٹیا نے اپنے اخبار کی دو قسطوں (۵ اگست، ۱۹ اگست ۱۹۹۰) میں اس کی بابت اپنے تاثرات شائع کیے ہیں۔ وہ خود اس میٹنگ میں شروع سے آخر تک موجود تھے۔ انھوں نے میری تقریر کا جو خلاصہ نکالا وہ یہ تھا کہ میرا مشن اسلام کی تبلیغ اور تبدیلیٔ مذہب (proselytisation) ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی رپورٹ کا عنوان ان لفظوں میں قائم کیا ہے ـــــ ایک مبلغ مولانا :

A Missionary Maulana

ایک ہی مقرر اپنی ایک تقریر کے مطابق مسلم اخبار کی نظر میں "دشمن اسلام" ہے، اور وہی مقرر اپنی اسی تقریر کے مطابق ہندو اخبار کی نظر میں "مبلغ اسلام" ـــــ کیسا عجیب ہے یہ فرق جو ایک اخبار اور دوسرے اخبار کے درمیان پایا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے اخبارات موجودہ زمانہ میں زرد صحافت (yellow journalism) کا ین نمونہ ہیں۔ اس کی ایک مثال مذکورہ واقعہ میں نظر آتی ہے۔ مسلمانوں کی یہ غیر اسلامی صحافت ہی شبہ موجودہ مسلمانوں کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

قیمتی نصیحت

تبلیغی جماعت کے ایک بزرگ نے تقریر کی۔ انھوں نے تبلیغ والوں کو مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ جہاں بھی رہیں، خاموشی کے ساتھ اپنا کام کریں۔ وہاں کا جو نظام ہے، اس میں نہ داخل ہوں اور نہ اس میں دخل دیں۔

یہ نہایت عمدہ نصیحت ہے۔ یہ اسلامی حکمت کے عین مطابق ہے۔ مثال کے طور پر آپ ایک یونیورسٹی میں ہیں۔ وہاں آپ نہ یونین کی سیاست میں داخل ہوں اور نہ وائس چانسلر کے خلاف ایجی ٹیشن کرنے میں حصہ لیں۔ آپ ایک حکومتی نظام میں ہیں۔ وہاں آپ نہ عہدہ کے طالب بنیں اور نہ حکومت اور ایڈمنسٹریشن کی مخالفت میں وہ سرگرمیاں دکھائیں جو اپوزیشن کے لوگ کیا کرتے ہیں۔ ان تمام چیزوں سے الگ رہ کر آپ اپنے لیے کام کا میدان تلاش کرلیں۔

اس طریق کار کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو ہر نظام میں کام کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ آدمی اگر نظام میں داخل ہو تو اس کو رقابتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور اگر وہ اس میں دخل دے تو نظام کی طرف سے طرح طرح کی رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو کام ہو سکتا ہے وہ بھی نہیں ہو پاتا۔ اور ساری طاقت بے فائدہ مشغولیتوں میں ضائع ہو کر رہ جاتی ہے۔

جو لوگ یہ طریقِ کار اختیار کریں وہ شکایت کی نفسیات سے بچے رہتے ہیں۔ ان کی نظر ان مواقع پر نہیں ہوتی جن پر دوسرے لوگ قبضہ کیے ہوتے ہیں۔ ان کی نظر ہمیشہ ان مواقع پر ہوتی ہے جو دوسروں کے قبضہ کے باوجود ابھی تک خالی پڑا ہوا ہے۔ اس طرح وہ تضاد سے محفوظ رہ کر ہر جگہ اپنے لیے کام کا میدان پالیتے ہیں۔ وہ اس قیمتی دولت کے مالک بن جاتے ہیں جس کو قرآن میں نفس مطمئنہ کہا گیا ہے۔

مفروضہ زیادتیوں کے خلاف "آواز بلند کرنا" کوئی کام نہیں ہے۔ بلکہ امکانی مواقع کو استعمال کرنا کام ہے۔ نظام کو توڑنے میں سرگرم ہونا کوئی کام نہیں، بلکہ ذہنوں کو بدلنے کے لیے محنت کرنا کام ہے۔ اخبار کے صفحات میں جگہ حاصل کرنا کوئی کام نہیں، بلکہ خاموش فکر میں لگنا اصل کام ہے۔ سڑکوں پر مظاہرہ کرنا کوئی کام نہیں۔ کام یہ ہے کہ آدمی اپنی تنہائیوں میں کام کے لیے تڑپے اور اس کی آنکھوں سے آنسو اُبل پڑیں۔

آخری فیصلہ

مہاراشٹر ہائی کورٹ کے ایک جج نے ایک وکیل کے خلاف ایسی زبان استعمال کی جو وکیل کے نزدیک قابل اعتراض تھی۔ جلد ہی دوسرے وکیلوں نے اس کا ساتھ دیا۔ مہاراشٹر اور گوا کی بار کونسل کی ایک ہنگامی میٹنگ کی گئی۔ اس میں متفقہ طور پر ایک رزولیوشن پاس کیا گیا کہ جج نے جو کچھ کہا، وہ اس کے دائرہ سے باہر تھا، اس بنا پر وہ اس قابل ہے کہ اس کی مذمت کی جائے۔

اس واقعہ پر ٹائمس آف انڈیا (۲۸ اپریل ۱۹۹۰) نے ایک نوٹ شائع کیا ہے، اس نوٹ کا عنوان بامعنی طور پر یہ ہے ——— فیصلہ کرنے والے کا فیصلہ کیا گیا:

Judge judged

میں نے اس کو پڑھا تو مجھے خیال آیا کہ یہی واقعہ زیادہ بڑے پیمانہ پر آخرت میں ہونے والا ہے۔ آخرت وہ دنیا ہے جہاں تولنے والے تولے جائیں، جہاں فیصلہ کرنے والوں کے اوپر دوبارہ فیصلہ کیا جائے۔

موجودہ دنیا میں کسی شخص کو ایک عہدہ حاصل ہے۔ کسی کو شہرت اور مقبولیت مل گئی ہے۔ کوئی پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا پر قبضہ کیے ہوئے ہے۔ کوئی شخص کسی اور قسم کی طاقت کا مالک ہے۔ ان حیثیتوں کا فائدہ اٹھا کر ایک شخص دوسرے شخص کو مجرم ثابت کر رہا ہے۔ ایک گروہ دوسرے گروہ کو برا بتا کر اس کی حیثیت کو لوگوں کی نظر میں بگاڑے ہوئے ہے۔

اس قسم کے تمام فیصلے اور پروپیگنڈے وقتی ہیں۔ یہ صرف اس وقت تک باقی رہنے والے ہیں جب تک کہ خداوند ذوالجلال ظاہر نہ ہو جائے جو تمام ججوں کا جج اور تمام فیصلہ کرنے والوں کے اوپر فیصلہ کرنے والا ہے۔ جب خدا ظاہر ہوگا تو وہ عین عدل اور انصاف کی بنیاد پر ہر ایک کا فیصلہ فرما دے گا۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ آج تو اللہ تعالیٰ حق اور ناحق اور صحیح اور غلط کو صرف اعلان کے درجہ میں لوگوں کو بتا رہا ہے۔ پھر جب اللہ کا حکم آئے گا تو وہ حق کے مطابق ہر ایک کا فیصلہ کر دے گا۔ اس دن سچے لوگ سرخرو ہوں گے اور غلط کار لوگ گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے (المومن ۷۸)

قدرت کا پیغام

جون ۱۹۸۹ء میں ایک ہفتہ کے لیے میں کشمیر گیا ہوا تھا۔ ایک روز کا واقعہ ہے۔ میں کچھ کشمیری بھائیوں کے ساتھ سرینگر کے باہر ایک ایسے مقام پر گیا جو بالکل کھلا ہوا تھا۔ سرسبز وادی اور برف پوش پہاڑوں کے درمیان ہمارے چاروں طرف پانی کے صاف شفاف چشمے بہتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان کے بہنے کی آواز قدرت کی دھیمی سرگوشی کی مانند ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

میں ایک چشمہ کے کنارے کھڑا ہو گیا۔ یہ تقریباً ۲ فٹ کی چوڑائی میں بہہ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ عین چشمہ کے بیچ میں ایک بڑا سا گول پتھر ابھرا ہوا ہے۔ صاف ستھرا پانی بہتا ہوا جب اس پتھر تک پہنچتا ہے تو وہ ایسا نہیں کرتا کہ وہ پتھر کو توڑ کر اپنے لیے سیدھا راستہ بنانے کی کوشش کرے۔ اس کے بجائے پانی ایسا کرتا ہے کہ وہ پتھر کے دائیں اور بائیں طرف سے مڑ کر نکل جاتا ہے۔ وہ پتھر سے ٹکراؤ کو اجتناب (avoid) کرتے ہوئے اپنا راستہ بنا لیتا ہے۔

میں نے اپنے کشمیری دوستوں سے کہا کہ اس کو دیکھیے۔ اس قسم کے مناظر پورے جموں اور کشمیر میں ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ آپ کے نام گویا قدرت کا پیغام ہے، فطرت کا یہ منظر خاموش زبان میں آپ کو بتا رہا ہے کہ چٹان سے نہ ٹکراؤ، بلکہ چٹان سے بچتے ہوئے اپنا راستہ نکالو۔

اس قسم کے چشمے کشمیر کی وادیوں میں سال بھر جاری رہتے ہیں۔ اس طرح قدرت کا یہ تعمیری پیغام کشمیر میں لاکھوں مقامات پر ہر روز نشر کیا جا رہا ہے۔ مگر آپ لوگ عین اسی کے درمیان رہتے ہوئے اس کو نہیں سنتے، آپ اس سے کوئی سبق نہیں لیتے۔

اس دنیا میں کامیابی اس کے لیے ہے جو اختلاف کے موقع پر اعراض کا طریقہ اختیار کرے۔ جو راستہ کی چٹانوں سے ٹکرائے بغیر اپنا سفر جاری رکھے۔ ایسا ہی شخص اس دنیا میں اپنی منزل پر پہنچتا ہے۔ کشمیر کے لوگوں کو فطرت کی اٹل زبان میں یہ سبق دے کر خدا نے انھیں اس مقام پر کھڑا کیا تھا کہ وہ اس حکمت کو اختیار کر کے اپنی زندگی کی تعمیر کریں اور پھر دنیا کو یہ پیغام دے کر دنیا کے رہبر بنیں۔ مگر کشمیر کے لوگ، شاعر کے الفاظ میں، خود بے راہ ہو کر اپنے کو برباد کر رہے ہیں، وہ دوسروں کو کیا رہنمائی دیں گے: او خویشتن گم است کرا رہبری کند

انسانی عظمت

اسٹیفن ہاکنگ (Stephen W. Hawking) ۱۹۴۲ میں امریکہ میں پیدا ہوا۔ ایم ایس سی کرنے کے بعد وہ پی ایچ ڈی کے لیے ریسرچ کر رہا تھا کہ اس پر ایک خطرناک بیماری کا حملہ ہوا۔ اپنے حالات کے ذیل میں اس نے لکھا ہے کہ میں ریسرچ کا ایک طالب علم تھا۔ میں مایوسانہ طور پر ایک ایسے مسئلہ کے حل کا منتظر تھا جس کے ساتھ مجھے پی ایچ ڈی کا مقالہ مکمل کرنا تھا۔ دو سال پہلے ڈاکٹروں نے تشخیص کیا تھا کہ مجھے ایک مہلک بیماری ہو چکی ہے۔ مجھے باور کرایا گیا تھا کہ میرے پاس اب زندہ رہنے کے لیے صرف ایک سال یا دو سال اور ہیں۔ ان حالات میں بظاہر میرے لیے پی ایچ ڈی پر کام کرنے کا زیادہ وقت نہیں تھا۔ کیوں کہ میں اتنی مدت تک زندہ رہنے کی امید نہیں کر سکتا۔ مگر دو سال گزرنے پر بھی میرا حال زیادہ خراب نہیں ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ واقعات میرے لیے زیادہ بہتر ہوتے جا رہے تھے:

> I was a research student desperately looking for a problem with which to complete my Ph.D. thesis. Two years before I had been diagonsed as suffering from ALS, commonly known as Lou Gehrig's disease, or motor neuron disease, and given to understand that I had only one or two more years to live. In these circumstances there had not seemed much point in working on my Ph.D. – I did not expect to survive that long. Yet two years had gone by and I was not that much worse. In fact, things were going rather well for me.
>
> (Stephen W. Hawking, *A Brief History of Time*, p. 53.)

ڈاکٹروں کے اندازہ کے خلاف اسٹیفن ہاکنگ زندہ رہا۔ اس نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ اس نے اپنی محنت سے اتنی لیاقت پیدا کی کہ کہا جاتا ہے کہ وہ آئن اسٹائن کے بعد سب سے بڑا نظریاتی طبیعیات داں ہے۔ آج وہ کیمبرج یونیورسٹی میں میتھمیٹکس کا پروفیسر ہے۔ یہ وہ کرسی ہے جو اب تک صرف ممتاز سائنس دانوں کو دی جاتی رہی ہے، اس کی صرف ایک کتاب (اے بریف ہسٹری آف ٹائم) ۱۹۸۸ میں چھپی تو وہ اتنی مقبول ہوئی کہ پہلے ہی سال اس کے چودہ اڈیشن شائع کیے گئے۔

انسان کی ذہنی صلاحیتیں اس کی ہر کمزوری کی تلافی ہیں۔ اس کا ارادہ ہر قسم کی رکاوٹوں پر غالب آتا ہے۔ وہ ہر ناکامی کے بعد اپنے لیے کامیابی کا نیا راستہ نکال لیتا ہے۔

زندگی کا راز

بل کازبی (Bill Cosby) ایک سیاہ فام امریکی ہے۔ وہ ۱۹۳۷ء میں ایک غریب خاندان میں پیدا ہوا۔ ابتداءً وہ بمشکل ایک ہزار ڈالر سالانہ کماتا تھا۔ آج اس کی سالانہ آمدنی کئی ملین ڈالر تک پہونچ چکی ہے۔ سفید فام امریکہ میں ایک سیاہ فام شخص کو یہ غیر معمولی کامیابی کیوں کر حاصل ہوئی۔ جواب یہ ہے کہ تعلیم اور دانش مندانہ جدوجہد کے ذریعہ۔ بل کازبی فلاڈالفیا کے ایک اسکول میں پانچویں گریڈ میں تھا۔ وہ اسکول میں اکثر تماشے کیا کرتا تھا اور پڑھائی پر زیادہ توجہ نہیں دیتا تھا۔ اس کی خاتون ٹیچر نیجل (Miss Nagle) نے ایک روز اس سے کہا کہ اگر تم جوکر بننا چاہتے ہو تب بھی تمہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔ تعلیم کے بغیر تم کسی بھی میدان میں ترقی نہیں کر سکتے (اسپان جنوری ۱۹۸۷)

بل کازبی نے اس نصیحت کو پکڑ لیا۔ اس نے پڑھنے میں محنت شروع کر دی۔ یہاں تک کہ اس نے ایجوکیشن میں ڈاکٹریٹ کر لیا۔ اس کے بعد اس نے تفریحی پروگراموں میں حصہ لینا شروع کیا۔ آخر کار اس کو ٹیلی ویژن پروگرام ملنے لگے۔ آج وہ امریکہ کا مشہور ترین کامیڈن (comedian) ہے۔ بل کازبی شو (Bill Cosby Show) امریکی ٹیلی وژن کا سب سے زیادہ مہنگا پروگرام ہوتا ہے۔ دوسرے بہت سے سیاہ فام امریکیوں کے برعکس، اس نے نسلی امتیاز کی باتیں کرنے سے پرہیز کیا۔ اس نے اپنی کہانیاں عالمی واقعات کی بنیاد پر بنائیں جو تمام لوگوں کے لیے قابل فہم ہو سکیں:

Unlike many other black comedians, he avoided racial nuances and drew his stories from the kind of universal occurrences that could be understood by all.

Span, January 1987

امریکی عام طور پر سیاہ فام لوگوں کو پسند نہیں کرتے۔ مگر وہ بل کازبی کے پروگرام کو نہایت شوق کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ بل کازبی نے سفید فام لوگوں کی رعایت کی تو سفید فام لوگوں نے بھی بل کازبی کی رعایت کرنا شروع کر دیا۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ دوسرے آپ میں دل چسپی لیں تو آپ بھی دوسروں میں دل چسپی لینا شروع کر دیجئے۔ اور اس کے بعد آپ کو کسی سے شکایت نہ ہو گی۔

سچّی خوشی

الزبیتھ ٹیلر (Elizabeth Taylor) جب ۲۸ سال کی عمر کو پہونچی تو وہ امریکہ میں گویا شہزادی بن چکی تھی۔ فوٹو گرافر ہر وقت اس کے پیچھے لگے رہتے تھے۔ اور اس کے منھ سے نکلا ہوا ہر لفظ اخباروں میں نمایاں طور پر شائع کیا جاتا تھا۔ اس نے چوتھی بار مئی ۱۹۵۹ میں ایڈی فشر (Eddie Fisher) سے شادی کی۔ مگر اب بھی اسے خوشی نہیں ملی۔ ایک ملین ڈالر سے اس نے اپنی مشہور ترین فلم کلیو پترا (Cleopatra) میں ہیروئن کا کردار ادا کرنا شروع کیا۔ مگر عین شوٹنگ کے وقت وہ بے ہوش ہو گئی اور اس کو اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

آج کل سب سے زیادہ شہرت ان لوگوں کو ملتی ہے جو سیاست کے اسٹیج پر یا فلم کے اسٹیج پر ظاہر ہوتے ہیں۔ مگر سیاست اور فلم کے ان ہیروؤں کے اندرونی حالات نہایت ابتر ہوتے ہیں۔ اخبارات کے صفحات میں یا ٹیلی ویژن کے اسکرین پر تو وہ ہنستے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر ان کی حقیقی زندگی اتنی غمزدہ ہوتی ہے کہ انھیں راتوں کو نیند نہیں آتی۔ ان میں سے اکثر کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ گولیاں کھاکر سوتے ہیں اور جب گولی سے بھی نیند نہیں آتی تو شراب اور منشیات کے ذریعہ غم غلط کرتے ہیں۔

کسی نے کہا کہ "سب سے زیادہ ہنسنے والے چہرے سب سے زیادہ غم گین چہرے ہوتے ہیں"۔ جو شخص اپنے دل کی کیفیت کے تحت ہنسے اس کا ہنسنا واقعی ہنسنا ہوتا ہے۔ مگر سیاسی لیڈر اور فلمی ہیرو وہ لوگ ہیں جو دوسروں کے لیے جیتے ہیں، جو دوسروں کو دکھانے کے لیے بولتے ہیں، ان کا ہنسنا ہمیشہ مصنوعی ہوتا ہے۔

سچی خوشی اس آدمی کے لیے ہے جو خود اپنی ذات میں جینا جانتا ہو۔ جو خود اپنے اندر زندگی کا راز پالے۔ باہر کے لیے جینے والے کبھی سچی خوشی حاصل نہیں کر سکتے۔

مصنوعی خوشی اور حقیقی خوشی میں وہی فرق ہے جو پلاسٹک کے بچہ میں اور زندہ بچہ میں۔ مصنوعی خوشی کا سرچشمہ آدمی کے وجود کے باہر ہوتا ہے۔ اور سچی خوشی کا سرچشمہ آدمی کے وجود کے اندر۔ آدمی اسی چیز سے خوش ہو سکتا ہے جو اندر سے ملے۔ باہر سے ملنے والی چیز کبھی آدمی کو حقیقی خوشی کی نعمت نہیں دے سکتی۔

قول کے ساتھ عمل

۲۸ اپریل ۱۹۹۰ کو جناب کلدیپ سنگھ گجرال (پیدائش ۱۹۴۰) سے ملاقات ہوئی۔ وہ الرسالہ سے بہت دل چسپی رکھتے ہیں اور اس کو ہر ماہ نہایت پابندی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

گجرال صاحب کے ساتھ جناب راحت ہاشمی صاحب بھی تھے۔ انھوں نے گفتگو کے دوران کہا کہ ایک ہفتہ پہلے میں گجرال صاحب کے ساتھ دہلی میں کسی سڑک پر چل رہا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ ایک سردار لڑکا بھیک مانگ رہا ہے۔ گجرال صاحب فوراً رک گیے۔ انھوں نے لڑکے کو بلایا اور کہا کہ تم سردار ہو کر بھیک مانگتے ہو۔ اس کو سمجھایا اور پھر کہا کہ یہ میرا پتہ ہے، کل تم میرے یہاں آجاؤ۔ میں تم کو کسی آفس میں لے چلوں گا اور وہاں تم کو کام دلاؤں گا۔

یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ سردار بھیک نہیں مانگتا۔ مگر سردار بھیک کیوں نہیں مانگتا۔ اس کا راز مجھے اس واقعہ کو سننے کے بعد سمجھ میں آیا۔

اس واقعہ پر غور کیجیے۔ اس واقعہ کے دو حصے ہیں۔ ایک ہے گجرال صاحب کا لڑکے سے کہنا کہ تم بھیک کیوں مانگتے ہو۔ دوسرا ہے، لڑکے سے یہ کہنا کہ تم میرے یہاں آجاؤ۔ میں تم کو کسی آفس میں کام دلادوں گا۔

آپ کو ایسے بے شمار لوگ ملیں گے جو بھیک مانگنے والوں کی قطاریں دیکھ کر ان کو برا کہیں۔ ان کے خلاف تقریر کریں اور مضامین لکھیں۔ مگر صرف اس قسم کی تقریر و تحریر سے بھیک مانگنا ختم نہیں ہوسکتا۔ بھکاریوں کو ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ صاحب استطاعت افراد ذاتی طور پر یہ ذمہ داری لیں کہ وہ بھیک کے پیشہ کو ختم کرنے کے لیے عملی طور پر اپنا حصہ ادا کریں گے۔

قوم کے اندر کوئی بھکاری نہ رہے، یہ بڑی اچھی سوچ ہے۔ مگر ایسا اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ کہنے والے اپنے قول کے ساتھ اپنے عمل کو بھی شامل کریں۔ عمل کے بغیر قول کا فائدہ صرف قائل کو ملتا ہے۔ مگر قول کے ساتھ عمل کا فائدہ ان لوگوں تک پہنچ جاتا ہے جن کے لیے قائل نے اپنی بات کہی تھی۔

اصلاح کا کریڈٹ صرف اس کو ملتا ہے جو کہنے کے ساتھ کرنے کے لیے بھی تیار ہو۔

بلند پروازی

جاپان ایر لائنز کا ایک جہاز (بوئنگ ۷۴۷) ۱۲ اگست ۱۹۸۵ کو ٹوکیو سے اڑا۔ اسے ایک گھنٹہ میں اوساکا پہونچنا تھا۔ مگر اڑان کے صرف ۱۰ منٹ بعد پائلٹ نے محسوس کیا کہ اس نے جہاز پر اپنا کنٹرول کھو دیا ہے۔ جہاز کو ۲۴ ہزار فیٹ کی بلندی پر اڑنا تھا۔ مگر وہ اترتے اترتے ۹۸۰۰ فٹ کی بلندی پر آگیا۔ اور بالآخر وہ پہاڑ سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا۔

اس جہاز کے ۵۲۰ مسافر مر گیے۔ ان مرنے والوں میں ہندستان کے ایک انجینیر مسٹر کلیان مکرجی اور ان کی بیوی بھی تھے۔ مسٹر مکرجی کی عمر بوقت حادثہ ۴۱ سال تھی۔ وہ ایک تجارتی مہم پر حال میں جاپان گیے تھے۔ جاپان سے انھوں نے اپنے لڑکے نرنجن مکرجی (۱۳ سال) کے نام خط لکھا کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ ۱۲ اگست کو ایک تفریحی سفر (pleasure trip) پر ٹوکیو سے اوساکا جا رہے ہیں۔ (ہندستان ٹائمس ۱۴ اگست ۱۹۸۵)

جہاز کو بلندی پر اڑانے کا ایک مقصد یہ ہے کہ وہ پہاڑوں یا اونچی عمارتوں سے نہ ٹکرائے۔ مذکورہ جہاز کے لیے "۲۴ ہزار فٹ" کی بلندی ایک محفوظ بلندی تھی۔ مگر جب اس کے انجن میں خرابی آگئی تو وہ اس محفوظ بلندی پر قائم نہ رہ سکا۔ وہ اترتے اترتے "۹۸۰۰" فٹ کی بلندی پر آگیا۔ اب وہ محفوظ بلندی کی سطح پر نہ رہا۔ چنانچہ وہ پہاڑ سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا۔

یہی معاملہ انسانی زندگی کا بھی ہے۔ ہماری زندگی کا سفر بے شمار انسانوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اگر ہم اپنے فکر و خیال کے اعتبار سے نچلی سطح پر سفر کریں تو بار بار دوسروں سے ٹکراؤ ہوتا رہے گا۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ آدمی فکر و خیال کے اعتبار سے اپنے آپ کو اتنی بلندی پر پہونچا دے کہ دوسروں سے ٹکراؤ کا امکان ہی اس کے لیے ختم ہو جائے۔

اعراض کا اسلامی اصول آدمی کو یہی بلندی عطا کرتا ہے۔ اعراض اپنی حقیقت کے اعتبار سے عین وہی چیز ہے جس کو بعض مفکرین نے زندگی کے مسئلہ کا برتر حل (superior solution) کہا ہے۔ برابر کی سطح پر سفر کرنے میں دوسروں سے ٹکراؤ کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لیے دانش مند آدمی اپنے سفر کی سطح کو بلند کر لیتا ہے۔ تاکہ دوسروں کے ساتھ اس کا ٹکراؤ نہ پیش آئے۔ اسی برتر حکمت کو اختیار کرنے کا نام اعراض ہے۔

ایک خودکشی

مسز پدما ڈیسائی مشہور صنعت کار راجہ رام کرو سکر کی صاحبزادی تھیں۔ ان کی شادی سابق وزیر اعظم ہند مرارجی ڈیسائی کے صاحبزادے مسٹر کانتی لال ڈیسائی سے ہوئی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی معاشی حیثیت کیا تھی۔ مگر ۱۶ نومبر ۱۹۸۴ کو انھوں نے اپنے پانچویں منزل کے فلیٹ سے کود کر خودکشی کرلی۔ اس وقت ان کی عمر ۵۱ سال تھی۔ نیچے گرنے کے فوراً بعد وہ اسپتال لے جائی گئیں۔ مگر ڈاکٹروں نے دیکھ کر بتایا کہ وہ اسپتال پہونچنے سے پہلے مر چکی ہیں۔

انھوں نے خودکشی کیوں کی، اس کی وجہ خبر میں ان الفاظ میں بتائی گئی ہے:

Padma committed suicide after hearing that the family has lost a case in the Supreme Court to retain their flat.

پدما نے یہ خبر سننے کے بعد خودکشی کرلی کہ ان کا خاندان اپنے فلیٹ کو قبضہ میں رکھنے کا کیس سپریم کورٹ میں ہار گیا ہے (ہندستان ٹائمس، ٹائمس آف انڈیا ۱۷ نومبر ۱۹۸۴)

۱۹۷۷ میں جنتا پارٹی کی کامیابی کے بعد مرارجی ڈیسائی وزیر اعظم ہوئے۔ وزارت عظمیٰ کی ڈھائی سالہ مدت میں ان کے صاحبزادے کانتی لال ڈیسائی نے کئی معاملات کیے۔ ان میں سے ایک مذکورہ فلیٹ بھی تھا۔ میرین ڈرائیو (بمبئی) میں ایک بڑی بلڈنگ ہے جس کا نام اوشیانا (Oceana) ہے۔ اس کی پانچویں منزل پر یہ فلیٹ تھا۔ جنتا حکومت کے خاتمہ کے بعد عدالت میں یہ کیس چلا کہ مسٹر کانتی لال ڈیسائی نے یہ فلیٹ غیرقانونی طور پر حاصل کیا تھا۔ عدالت نے اس کے حق میں فیصلہ دیا۔ مسز پدما ڈیسائی کو اس فیصلہ کی خبر بذریعہ ٹیلی فون ملی۔ اس کے بعد انھوں نے چھلانگ لگا کر خودکشی کرلی۔

خاتون نے سمجھا کہ وہ خودکشی کر کے ہمیشہ کے لیے عدالت کے فیصلہ سے نجات حاصل کر رہی ہیں۔ لیکن اگر انھیں معلوم ہوتا کہ وہ خودکشی کر کے اپنے آپ کو زیادہ بڑی عدالت میں پہونچا رہی ہیں جہاں اس قسم کے کسی اقدام کا موقع ان کے لیے باقی نہیں رہے گا، تو ان کا فیصلہ بالکل مختلف ہوتا۔

آدمی کی سب سے بڑی کمزوری عجلت پسندی ہے۔ وہ فوری طور پر ایک سخت اقدام کر بیٹھتا ہے، حالاں کہ اگر وہ سوچے تو کبھی ایسا نہ کرے۔

بے فائدہ

تحریک نسواں (feminism) کے مغربی علم برداروں کا کہنا تھا کہ عورت اور مرد ہر اعتبار سے بالکل یکساں ہیں۔ ان میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں۔ چنانچہ انھیں مسز (Mrs) کے لفظ پر اعتراض ہوا۔ انھوں نے کہا کہ عورت کو اس کے شوہر کے نام کے ساتھ مسز لگا کر کہنا عورت کی توہین ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورت کی کوئی علیحدہ شخصیت نہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ جس طرح مرد کے لیے ایک مستقل لفظ مسٹر (Mr) ہے۔ اسی طرح عورت کے لیے بھی ایک مستقل لفظ ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے مز (Ms) کا لفظ تجویز کیا جو محدود طور پر رائج ہوا۔

تاہم تحریک نسواں کے وکیل اس سے مطمئن نہ ہو سکے۔ اس کے بعد انھوں نے کہنا شروع کیا کہ جنس (تذکیر و تانیث) کو ظاہر کرنے والے الفاظ ہی سرے سے ڈکشنری سے نکال دیے جائیں۔ اس تحریک نے امریکی حکومت کو اس حد تک متاثر کیا کہ ۱۹۷۹ میں امریکہ کے صحت، تعلیم اور فلاح عامہ کے محکموں نے ہدایت جاری کر دی کہ ایسے انگریزی الفاظ استعمال نہ کیے جائیں جن سے جنس کا اظہار ہوتا ہو۔ ایسے کاغذات اور فارم جن میں جنس کو ظاہر کرنے والے الفاظ استعمال کیے گئے ہوں، ان حکومتی شعبوں میں قبول نہیں کیے جائیں گے۔ ممنوعہ الفاظ کی لمبی فہرست میں سے چند الفاظ یہ ہیں:

he, she, mother, father, chairman, housewife, policeman, mankind

اس کے مطابق، مثال کے طور پر، یہ حکم دیا گیا کہ آئندہ ملک مین (milkman) کو ڈیری پروڈکٹس ڈیلورر (dairy products deliverer) کہا جائے، وغیرہ۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ٹائمس آف انڈیا (یکم نومبر ۱۹۷۹) نے لکھا تھا کہ تذکیر و تانیث کو ختم کرنے کے بجائے وہ کیوں اس میں مشغول نہیں ہوتے کہ بھوک، بے روزگاری اور بے امنی کو ختم کریں:

Rather than abolish gender, why don't they get busy
with the abolition of hunger, unemployment and insecurity.

جو کام ضروری ہے، اس میں کوئی اپنے آپ کو مشغول نہیں کرتا۔ البتہ جو کام غیر ضروری ہے اس میں ہر آدمی دوڑ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اصلاح کے نام پر ہونے والی بے شمار سرگرمیوں کے باوجود حقیقی اصلاحی نتیجہ کہیں نظر نہیں آتا۔

نفسیاتی کمزوری

پٹرونیس آربٹر (Petronius Arbiter) رومی بادشاہ نیرو (Nero) کا ایک قریبی دوست تھا۔ اس کی غیر معمولی صلاحیت کی بنا پر اس کو روم کا مجسٹریٹ مقرر کیا گیا۔ اس نے ۶۶ء میں وفات پائی۔ اس کا ایک قول انگریزی میں اس طرح نقل کیا گیا ہے —— انسانی دماغ ہمیشہ اس چیز کی تمنا میں رہتا ہے جس کو اس نے کھو دیا ہے :

The mind longs for what it has missed.

یہ بات حال کے لیے بھی اتنی ہی صحیح ہے جتنی وہ ماضی کے لیے صحیح تھی۔ نیز یہ کہ یہ نفسیاتی کمزوری اتنی عام ہے کہ افراد اور اقوام دونوں اس میں یکساں طور پر مبتلا رہتے ہیں۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ کھوئی ہوئی چیز اگرچہ ماضی میں لامعلوم تھی مگر حال میں وہ پوری طرح معلوم چیز بن چکی ہوتی ہے۔ ماضی میں وہ پوری طرح معلوم اور واضح نہ ہونے کی وجہ سے آدمی کی توجہ کا مرکز نہ بن سکی۔ مگر بعد کو وہ مکمل طور پر علم کے دائرہ میں آجاتی ہے۔ اس لیے انسان اس کو اپنی توجہ کا مرکز بنالیتا ہے۔ مگر یہ نادانی کے سوا اور کچھ نہیں۔

اسی انسانی کمزوری کی بنا پر قوموں کے اندر سطحی قیادتیں جنم لیتی ہیں۔ سطحی قیادت ہمیشہ "معلوم محرومیوں" پر اٹھتی ہے۔ کیوں کہ معلوم محرومیوں پر قوموں کو ابھارنا بے حد آسان ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر پاکستان میں اگر ایک لیڈر یہ نعرہ لگائے کہ "لینا ہے کشمیر" تو اس کو فوراً عوام کے درمیان مقبولیت حاصل ہو جائے گی۔ کروروں روپیہ کا چندہ وہ نہایت آسانی کے ساتھ جمع کر لے گا۔ کیوں کہ کشمیر کا کھویا جانا پاکستانیوں کے لیے ایک معلوم واقعہ بن چکا ہے۔

اس کے برعکس اگر پاکستان کا ایک مسلم رہنما کہے کہ ہم کو داعی گروہ کی حیثیت سے اٹھنا ہے تو ایسی پکار پر کبھی عوام کی بھیڑ جمع نہیں ہوگی۔ کیوں کہ داعیانہ حیثیت کا کھونا عوام کے لیے کوئی معلوم واقعہ نہیں۔ جھوٹی قیادت ہمیشہ معلوم محرومیوں کی بنیاد پر اٹھتی ہے اور سچی قیادت ہمیشہ نامعلوم محرومی کی بنیاد پر۔ یعلمون ظاھرا من الحیاۃ الدنیا وھم عن الآخرۃ ھم غافلون

(الروم ۷)

کون سا مذہب

ڈاکٹر رادھاکرشنن (۱۹۷۵ - ۱۸۸۸) ہندستان کے مشہور مصنف اور فلسفی تھے۔ ان کی ایک کتاب وہ ہے جس کا نام مذہب اور کلچر (Religion and Culture) ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے دکھایا ہے کہ مذہب انسان کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے۔ مذہب کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس سلسلہ میں وہ کہتے ہیں کہ سوال مذہب یا بے مذہب کا نہیں بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ کس قسم کا مذہب:

There is no question of religion or no religion, but what kind of religion.

ڈاکٹر رادھاکرشنن نے جس قسم کے مذہب کی وکالت کی ہے، وہ مذہب وہ ہے جو وحدتِ ادیان پر عقیدہ رکھتا ہو۔ یعنی یہ تصور کہ ایک ہی آفاقی حقیقت ہے جو ہر مذہب میں ظاہری فرق کے ساتھ پائی جاتی ہے۔

یہ نظریہ دراصل جزء پر کل کو قیاس کر کے وضع کیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دو مختلف سچائیوں میں جزئی فرق ہو سکتے ہیں، تاہم اس جزئی فرق کے باوجود دونوں سچائیاں ایک مانی جائیں گی۔ مگر جب فرق کلی نوعیت کا ہو، مثلاً ایک مذہب کہے کہ خدا ہے، اور دوسرا مذہب کہے کہ مستقل بالذات حیثیت سے خدا کا کوئی وجود نہیں۔ اس طرح کے فرق جہاں پائے جائیں وہاں کوئی ایک ہی مذہب سچا ہوگا نہ کہ دونوں مذہب۔

مذہب کی ایک قسم وہ ہے جو ذاتی تجربات کو مذہب کی بنیاد بتاتی ہے۔ اس قسم کا مذہب سراسر ناقابل قبول ہے۔ کیوں کہ اصل سوال استناد کا ہے۔ ذاتی تجربہ کی بنیاد پر جو مذہب بنے، اس کو مستند نہیں کہا جا سکتا۔ اس لیے وہ قابل قبول بھی نہیں ہو سکتا۔

وہ کون سا مذہب ہے جس کو اختیار کیا جائے۔ خالص علمی اعتبار سے اس کا جواب یہ ہے کہ وہ مذہب جو ثابت شدہ ہو۔ یعنی وہ مذہب جو تاریخ کے معیار پر مستند ثابت ہو۔ وہ مذہب جس کا پیغمبر تاریخی پیغمبر ہو۔ جس کی دی ہوئی کتاب اپنی اصل صورت میں محفوظ ہو۔ جو تاریخ کی کسوٹی پر پوری طرح معتبر قرار پاتا ہو۔

دس سال خاموش

خلافت تحریک بیسویں صدی کے آغاز میں اٹھی اور ۱۹۲۴ میں آخری طور پر ختم ہوگئی۔ تقریباً دس سال تک ہندستانی مسلمانوں میں اس کا ہنگامہ جاری رہا۔ مولانا اشرف علی تھانوی (۱۸۶۳ - ۱۹۴۳) غالباً واحد نمایاں شخص تھے جو اس کے مخالف تھے اور اس پر سخت تنقید کرتے تھے۔

مولانا تھانوی کے ملفوظات میں ہے کہ "جس زمانہ میں تحریک خلافت کا شباب تھا، شورش پسند طبیعتیں جوش میں بھڑک رہی تھیں۔ چار طرف آگ لگی ہوئی تھی۔ یہاں تک نوبت آگئی تھی کہ علاوہ برا بھلا کہنے اور لعن طعن اور قسم قسم کے بہتان و الزامات لگانے کی دھمکی کے خطوط میرے پاس آئے کہ یا تو شریک ہوجاؤ ورنہ قتل کردئے جاؤ گے۔"

مولانا تھانوی اس سلسلہ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں تحریک خلافت کے ایک ممتاز حامی میرے پاس آئے اور کہا کہ آپ اس تحریک میں شریک کیوں نہیں ہوتے۔ میں نے کہا کہ اس کام کو کرنے کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی امیر المومنین ہو۔ اس شرط کی تکمیل کے بغیر یہ ساری تحریک غلط ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ہم آپ ہی کو امیر المومنین بناتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں امیر المومنین بننے کے لئے تیار ہوں۔ مگر اس میں کچھ شرائط ہیں۔

مولانا تھانوی کی پیش کردہ پہلی شرط کا خلاصہ یہ تھا کہ تمام ہندستان کے مسلمان اپنا تمام مال اور جائداد میرے نام ہبہ کردیں۔ کیوں کہ مال کے بغیر کوئی امیر المومنین کچھ نہیں کرسکتا۔

دوسری شرط یہ ہے کہ ہندستان کے تمام مشاہیر علماء اور لیڈروں کے دستخط کراؤ کہ وہ مجھ کو امیر المومنین تسلیم کرلیں۔ اگر بلا اختلاف سب نے تسلیم کرلیا تو میں امیر المومنین ہوں گا۔ اگر ایک نے بھی اختلاف کیا تو میں امیر المومنین نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ اختلاف کی صورت میں امیر امیر نہیں ہوسکتا۔ ہاں اگر تسلیم کے بعد پھر کوئی اختلاف یا خلاف کرے تو امیر کو حق ہے کہ وہ اپنی قوت سے ایسے لوگوں کو دبائے اور ٹھیک کرے۔ قبل از تسلیم حق نہیں کہ اس کو دبایا جائے۔"

اس کے بعد مولانا تھانوی نے کہا: "اب سنئے کہ امیر المومنین ہونے کے بعد سب سے اول جو حکم دوں گا وہ یہ ہوگا کہ دس سال تک کے لئے سب خاموش۔ ہر قسم کی تحریک اور ہر قسم کا شور وغل

بند۔ اس دس سال میں انتظام کروں گا مسلمانوں کو مسلمان بنانے کے اور ان کی اصلاح کے لئے باقاعدہ انتظام ہوگا۔ غرض کہ مکمل انتظام کے بعد جو مناسب ہوگا حکم دوں گا۔ عملی صورت یہ ہے کام کرنے کی۔ اور اگر محض کاغذی امیر المومنین بنانا چاہتے ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آج امیر المومنین ہوں گا کل کو اسیر الکافرین ہوں گا۔ آج سردار بنوں گا، کل سر دار ہوں گا۔"

مولانا تھانوی اس کے بعد کہتے ہیں: "خلاصہ یہ ہے کہ ہر کام اصول سے ہوسکتا ہے۔ بے اصول تو گھر کا انتظام بھی نہیں ہوسکتا۔ ملک کا تو کیا خاک انتظام ہوگا۔ یہ ہیں وہ اصولی باتیں جن پر مجھ کو برا بھلا کہا جاتا ہے اور قسم قسم کے الزامات و بہتان میرے سر تھوپے جاتے ہیں اور لوگ مجھ سے خفا ہیں۔ اور وجہ خفا ہونے کی صرف یہ ہے کہ میں کہتا ہوں کہ اصول کے ماتحت کام کرو۔ جوش سے کام مت لو۔ ہوش سے کام لو۔ جوش کا انجام خراب نکلے گا۔ حدود شرعیہ کی حفاظت رکھو۔ وہ ان باتوں کو اپنے مقاصد میں روڑا اٹکانا سمجھتے ہیں۔" (الافاضات الیومیہ، جلد اول صفحہ ۱۰۴-۱۰۱)

مولانا تھانوی کی ان انتہائی معقول باتوں کو کسی نے نہیں سنا۔ تمام مسلمان پر جوش خطیبوں کی آواز پر بے معنی دوڑ لگاتے رہے۔ اپنے زمانہ کے مسلمانوں کی تصویر کشی کرتے ہوئے مولانا تھانوی کہتے ہیں: مسلم عوام کی حالت یہ ہے کہ جس نے مرضی کے موافق فتویٰ دے دیا، یا کوئی عالم یا لیڈر ان کے ساتھ ہولیا، اس میں سب کمالات ہیں۔ اس کو عرش پر پہنچا دیں گے۔ اگر کسی نے مرضی کے خلاف کوئی بات کی تو تحت الثریٰ میں اس کو جگہ ملنا مشکل۔ غرض کہ ایک گڑبڑ ہے۔ اور یہ طریقہ کار جو موجود ہے، یہ سراسر اسلام اور شریعت سب کے خلاف ہے۔ اس کو اسلام اور مسلمانوں سے کیا تعلق (صفحہ ۱۱۱)

اس واقعہ سے ان لوگوں کو سبق لینا چاہئے جو یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا کوئی صحیح لیڈر نہیں۔ اصل بات یہ نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مسلمان اپنے بگڑے ہوئے مزاج کی بنا پر کسی صحیح آدمی کو اپنا لیڈر نہیں بناتے۔ وہ جھوٹے الفاظ بولنے والوں کے پیچھے دوڑتے ہیں، اور جو آدمی سچے الفاظ بولے، اس سے انھیں کوئی دل چسپی نہیں ہوتی۔ آج مسلمانوں کا حال، قرآن کے مطابق، یہ ہو رہا ہے کہ اگر ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا راستہ نہ بنائیں گے اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا راستہ بنالیں گے (الاعراف ۱۴۶)

تعمیر یا تخریب

"وفاق" پاکستان کا ایک روزانہ اخبار ہے جو لاہور، راولپنڈی، سرگودھا اور رحیم یار خاں سے بیک وقت شائع ہوتا ہے۔ اس کے شمارہ ۱۰ مئی ۱۹۹۰ کے صفحہ اول پر ایک تصویر ہے جس میں مسلمانوں کا ایک ہجوم قہقہہ لگا رہا ہے اور پتھر اور لکڑی سے کسی چیز کو مار رہا ہے۔ اس تصویر کے نیچے یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں: جماعت اسلامی کے زیر اہتمام عریانی اور فحاشی کے خلاف مظاہرے۔ مظاہرین ٹی وی سیٹ کو توڑ رہے ہیں۔

اس کے ساتھ خبر میں بتایا گیا ہے کہ "جماعت اسلامی کی انسداد منکرات مہم کے آخری روز حسن اسکوائر، گلشن اقبال (کراچی) کے نزدیک علامتی طور پر ٹی وی کو سنگسار کر کے بے راہ روی عریانی اور فحاشی کے خلاف نفرت کا اظہار کیا گیا۔ ٹی وی سیٹ پر جب ایک ساتھ ہزاروں پتھر برسے تو ٹی وی ایک لمحہ میں چکنا چور ہو گیا۔ جماعت اسلامی کا یہ مظاہرہ اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد مظاہرہ تھا جس میں ہزاروں افراد شریک ہوئے۔ مظاہرین سے خطاب کرتے ہوئے جماعت اسلامی کے نائب امیر اور اسلامی جمہوری اتحاد کے سکریٹری جنرل پروفیسر غفور احمد نے کہا کہ آج ٹی وی سیٹ تباہ کیا گیا ہے، لیکن اگر ٹی وی نے اپنی روش نہ بدلی تو کل عوام کے ہاتھ ٹی وی اسٹیشن کے در و دیوار تک پہنچ جائیں گے۔ اگر ٹی وی نے اپنا رویہ نہ بدلا اور شیطانی کام کرتا رہا تو شیطان کے ایجنٹوں کے ہاتھ توڑ دئے جائیں گے۔"

تقریباً یقینی ہے کہ جن لوگوں نے ٹی وی سیٹ پر سنگ باری کر کے ٹی وی سیٹ کو توڑا، ان میں سے اکثر کے گھروں میں ٹی وی سیٹ موجود ہو گا۔ ایسی حالت میں یہ خود ایک شیطانی فعل ہے کہ چوک پر ایک ناکارہ ٹی وی سیٹ رکھ کر اس پر پتھر مارے جائیں اور یہ امید کی جائے کہ ملک سے ٹی وی کی برائی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ٹی وی کی برائی لوگوں کے اپنے اندر ہے نہ کہ ٹی وی اسٹیشن یا حکومتی ایوان کے اندر۔

اگر ٹی وی کی برائی کو ختم کرنا ہے تو لوگوں کے دلوں کو بدلئے، حکومت کے خلاف نعرہ لگانے سے ٹی وی کی برائی کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ حتی کہ اگر حکومت پاکستان ٹی وی کے موجودہ تمام

پروگراموں کو بند کر کے صبح وشام ٹی وی کے اوپر صرف تلاوت قرآن کے پروگرام نشر کرنے لگے تب بھی موجودہ حالت میں اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

جنرل ضیاء الحق کے طویل زمانۂ حکومت میں اس کا ایک تجربہ کیا گیا اور مکمل طور پر ناکام رہا۔ مثلاً ضیاء الحق صاحب نے کہا کہ ہندستانی فلموں میں عریانی اور فحاشی ہوتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے پاکستان میں ہندستانی فلموں پر مکمل پابندی لگادی۔ مگر اس کے بعد جو فرق ہوا وہ صرف یہ تھا کہ جس ہندستانی فلم کو اس سے پہلے لوگ پکچر ہاؤس میں یا ٹیلی وژن سیٹ پر دیکھتے تھے، اس کو اب وہ ویڈیو کیسٹ کے ذریعہ خود اپنے گھر کے اندر وی سی آر پر دیکھنے لگے۔

جنرل محمد ضیاء الحق کو پاکستان میں ساڑھے گیارہ سال تک مکمل اقتدار حاصل رہا۔ جماعت اسلامی کے بانی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے لے کر ہندستان کے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تک تمام لوگوں کے نزدیک وہ مردِ حق اور مردِ مومن تھے۔ مزید یہ کہ انھوں نے ٹیلی ویژن کی وزارت (وزارت اطلاعات) پوری طرح جماعت اسلامی کو دے دی۔ جماعت اسلامی کا وزیر اطلاعات اور جنرل ضیاء الحق کا فوجی ڈنڈا دونوں مل کر پاکستان میں ٹیلی ویژن کی برائی کو ختم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس کے باوجود ٹیلی ویژن کی برائی میں ایک فیصد بھی کمی نہیں ہوئی۔ بلکہ ایک اندازے کے مطابق اس میں مزید اضافہ ہو گیا۔

اس تجربہ نے واضح طور پر ثابت کیا کہ جماعت اسلامی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا یہ نظریہ غلط ہے کہ ٹیلی ویژن (اور اس طرح کی دوسری سماجی برائیوں) کی اصلاح حکومت کی طاقت سے ہوتی ہے۔ اگر یہ اصلاح حکومت کی طاقت کے ذریعہ ہونے والی ہوتی تو وہ اس سے پہلے اس وقت ہو چکی ہوتی جب کہ جماعت اسلامی کے وزیر اطلاعات اور "مردِ حق ضیاء الحق" کو حکومت کی طاقت حاصل تھی۔ اور وہ اس کے ذریعہ ٹیلی ویژن (اور دوسری سماجی برائیوں) کو ختم کرنے کی مہم چلا رہے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے لوگوں نے جو پتھر ٹیلی ویژن سیٹ پر مارے، وہ پتھر انھیں خود اپنے آپ پر مارنا چاہئے۔ انھیں چاہیے کہ جماعت اسلامی اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کے بے بنیاد سیاسی نظریات کا ایک پتلا بنائیں اور پاکستان کے ہر چوک پر رکھ کر اس کو سنگسار کریں۔ یہی بے بنیاد نظریہ پاکستان میں "ٹی وی" جیسی برائیوں کو ختم کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

کیوں کہ جماعت اسلامی کے لوگ اگر اس بے بنیاد نظریہ میں گم نہ ہوتے تو وہ اپنی کوششوں کو سیاست کی چٹان پر ضائع نہ کرتے بلکہ اس کو افراد کی اصلاح میں لگاتے۔ اور پھر وہ مقصد اب تک حل ہو چکا ہوتا جو غلط مقام پر محنت کرنے کی وجہ سے حاصل نہ ہو سکا۔

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے انتہائی بے بنیاد طور پر یہ نظریہ بنایا کہ سماج کی یا سماجی شعبوں کی اصلاح حکومت کی طاقت سے ہوتی ہے، اس لئے حکومت کی طاقت پر قبضہ کرو۔ جماعت اسلامی کے افراد اسی بے بنیاد نظریہ سے متاثر ہو کر پچھلے پچاس برس سے حکومت پر قبضہ کرنے کی مہم چلا رہے ہیں۔

دلیل کے اعتبار سے یہ نظریہ پہلے ہی رد کیا جا چکا تھا۔ مگر تجربہ کے اعتبار سے وہ جنرل ضیاء الحق کے زمانہ حکومت (۱۹۸۸ - ۱۹۷۷) میں رد ہو گیا۔ اب اگر جماعت کے لوگ اپنی کوششوں کو مفید بنانا چاہتے ہیں تو انھیں چاہئے کہ وہ اپنے سابقہ سیاسی نظریہ کی غلطی کا اعلان کریں۔ اور اس کے بعد موجودہ تخریبی طریقوں کو چھوڑ کر خالص اصلاحی انداز میں افراد کی ذہنی تعمیر میں لگ جائیں۔ یہ اگرچہ ایک دیر طلب کام ہے، اور اس میں عوامی لیڈری بھی نہیں ملتی، تاہم کسی معاشرہ میں کوئی حقیقی نتیجہ پیدا کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی دوسری تدبیر نہیں۔

حکومت کی طاقت سے سماجی برائیوں کو دور کرنا، بظاہر ایک خوب صورت نظریہ ہے۔ مگر وہ عملاً ناممکن ہے۔ اگر آپ انسان کو بدلے بغیر حکومتی سطح پر برائیوں کو ختم کرنے کی کوشش کریں تو اس کا نتیجہ صرف یہ ہو گا کہ برائی ایک نئی صورت میں قائم ہو جائے گی، وہ لوگوں کی زندگیوں سے ختم نہیں ہو سکتی۔

برائی کو ختم کرنے کے سلسلہ میں پہلا کام افراد کے اندر برائیوں کو چھوڑنے کی آمادگی پیدا کرنا ہے۔ اس آمادگی کو پیدا کرنے سے پہلے "انسداد منکرات" کے نام پر حکومت کے خلاف ایجی ٹیشن چلانے سے منکرات کا انسداد تو نہیں ہو گا البتہ پورا سماج تخریبی سماج بن جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ عوام کی بھیڑ کو جمع کر کے چوراہہ پر ٹی وی سٹ کے اوپر پتھر مارنا صرف جھوٹی لیڈری ہے۔ سچا لیڈر وہ ہے جو عوام کو اس پر آمادہ کرے کہ وہ اپنے گھروں میں جا کر اپنا اپنا ٹی وی سٹ توڑ ڈالیں۔ اور ایسا لیڈر سارے عالم اسلام میں کوئی ایک بھی نہیں۔ ■

تربیتی ضمیمہ

ہندستان میں مالی بدعنوانی بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے۔ چنانچہ ملک کے سیاسی ذمہ دار، مذہبی پیشوا اور دانشور طبقہ مسلسل اس کے خلاف لکھتا اور بولتا رہتا ہے۔ مگر یہاں کی مالی بدعنوانیوں میں ایک فی صد بھی کمی نہ ہو سکی۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ نراد چودھری نے بجا طور پر لکھا ہے کہ اس کی وجہ ہندو قوم کی دولت پرستی ہے۔ ہندو عقیدہ کے مطابق، دولت ایک معبود ہے اور لکشمی دیوی کی صورت میں ہر ہندو اس کی پرستش کرتا ہے۔ ایسی صورت میں ناممکن ہے کہ محض دولت کے خلاف ایڈریس دینے سے دولت پرستی کا خاتمہ ہو جائے۔ یہ ذہن بدلنے کا معاملہ ہے نہ کہ محض اخلاقی نصیحت کرنے کا۔

عجیب بات ہے کہ یہی خرابی موجودہ زمانہ کے اسلام پسندوں میں ایک اور شکل میں پائی جا رہی ہے۔ اس کی ایک مثال جماعت اسلامی کا معاملہ ہے۔ جماعت اسلامی کے سنجیدہ حلقہ میں پچھلے پچاس برس سے یہ احساس پایا جاتا رہا ہے کہ جماعت کے افراد میں سیاسی ذوق تو خوب ابھرتا ہے مگر روحانی ذوق ان کے اندر پیدا نہیں ہوتا۔

جماعت کے ذمہ داروں نے اس مسئلہ کا حل "تربیت" میں تلاش کیا ہے۔ غالباً ۱۹۵۲ میں جماعت اسلامی کے مرکز (رامپور) کے تحت پہلا تربیتی کیمپ قائم کیا گیا۔ اس کے انچارج مولانا سید حامد علی تھے۔ اس کے تحت "بیچ" کی صورت میں کچھ افراد کو پندرہ پندرہ دن کے لئے بلایا جاتا تھا۔ اور ان کو تربیتی کورس سے گزارا جاتا تھا۔ مگر چند ہی بیچ کے بعد محسوس ہوا کہ یہ بے فائدہ ہے۔ چنانچہ اس پروگرام کو ختم کر دیا گیا۔

اب جماعت اسلامی کی نئی قیادت کے تحت اس کو دوبارہ اس طرح زندہ کیا گیا ہے کہ جماعت کے مرکز (دہلی) میں جماعت کے ایک بزرگ کو "نائب امیر برائے تربیت" مقرر کیا گیا ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ صرف سادہ لوحی ہے۔ یہ ماضی کی غلطی کو حال میں دہرانا ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی اور حقیقت نہیں (دعوت ۲۸ مئی ۱۹۹۰)

جماعت اسلامی کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلام

کی تعبیر خالص سیاسی انداز میں کی۔ حتی کہ انھوں نے اذان اور نماز اور روزہ جیسے روحانی عمل کو بھی سیاسی عمل بنا کر دکھایا۔ جماعت اسلامی کے افراد کا ذہن اسی قسم کے سیاسی لٹریچر کو پڑھ کر بنا ہے۔ وہ اسلام کے پورے معاملہ کو سیاسی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایسی حالت میں عین فطری بات ہے کہ جماعت کے افراد میں سیاسی مزاج ہو، ان کے اندر روحانی مزاج نہ ہو۔ اگر آپ ببول کا بیج بوئیں تو اس سے آم کے پھل کی امید کرنا احمقانہ خوش فہمی کے سوا اور کچھ نہیں۔

تربیت بذات خود ایک اسلامی عمل ہے اور اس کو قرآن میں تزکیہ کہا گیا ہے (ویزکیھم) مگر تربیت (یا تزکیہ) اس وقت مفید ہوتا ہے جب کہ وہ فکری یاد دہانی کے لئے ہو۔ جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ آدمی کو اس کا ایک بھولا ہوا سبق از سر نو یاد دلایا جائے۔

مگر جماعت اسلامی کے معاملہ میں اصل مسئلہ فکری یاد دہانی کا نہیں بلکہ فکری تغیر کا ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے لٹریچر نے جماعت کے افراد کے فکری ڈھانچہ کو سیاسی ڈھانچہ بنا دیا ہے جو روحانی ڈھانچہ کی عین ضد ہے۔ جب تک اس سیاسی ڈھانچہ کو توڑا نہ جائے، روحانی سبق کا کوئی فائدہ نہیں۔ ایسے آدمی کے ذہن پر سیاست کا ڈاٹ لگا ہوا ہوتا ہے۔ اس ڈاٹ کو توڑنے کے بعد ہی ذہن کے اندر کوئی نئی چیز داخل ہو سکتی ہے۔ اس سے پہلے نہیں۔

اگر آپ کہیں کہ "دین سے مراد اسٹیٹ ہے" تو یہ نظریہ آدمی کے اندر صرف سیاسی انداز فکر پیدا کرے گا۔ اس کے بعد یہ کہنا کہ "اسٹیٹ قائم کرنے کے لئے صالح افراد درکار ہوتے ہیں۔ اس لئے لوگوں کو چاہئے کہ وہ اللہ سے ڈریں تاکہ اچھی اسٹیٹ قائم کر سکیں" تو یہ سیاسی ہاتھی کے دم میں روحانیت کا پتنگ باندھنا ہوگا۔ اس قسم کے تربیتی پیوند کے ذریعہ کبھی کسی کے اندر روحانیت کا طوفان برپا نہیں ہو سکتا۔

اس کے برعکس اگر آپ یہ کہیں کہ "دین یہ ہے کہ آدمی اللہ سے ڈرے" تو یہ عقیدہ آدمی کے اندر روحانی ہلچل پیدا کرنے کا سبب بنے گا۔ جو لوگ اس فکر سے متاثر ہوں گے، وہ اپنے ابتدائی تاثر ہی کے اعتبار سے روحانی انسان بن جائیں گے۔ آدمی کی ذہنی تربیت ہمیشہ وہ فکر کرتا ہے جس نے اس کے ذہن کو پیدا کیا ہے۔ نہ کہ کسی قسم کا تربیتی ضمیمہ۔

جماعت اسلامی کے افراد کی تربیت حقیقۃً یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ یہ اعلان کیا جائے

کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلام کی جو سیاسی تعبیر کی وہ سراسر غلط تھی۔ اس کے بعد جماعت اسلامی کے افراد کو ہدایت کی جائے کہ وہ قرآن کو قرآن کے ذریعہ پڑھیں نہ کہ تفہیم القرآن کے ذریعہ۔ اس طرح کی انقلابی کوششوں سے تو یقیناً جماعت کے افراد کی تربیت ہوسکتی ہے۔ مگر موجودہ فکری حالت کو باقی رکھتے ہوئے "محکمۂ تربیت" قائم کرنے کا کسی بھی درجہ میں کوئی فائدہ نہیں۔ جماعت اسلامی کا سیاسی نظریہ محرک روحانیت کو ختم کر دیتا ہے۔ اور محرک روحانیت کو ختم کرنے کے بعد کسی تربیتی ضمیمہ کے ذریعہ آدمی کے اندر روحانیت پیدا نہیں کی جا سکتی۔

آدمی کا کردار آدمی کے فکر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ کسی آدمی کے اندر جس ڈھنگ کی فکری اٹھان ہوگی اسی ڈھنگ کا کردار اس کے اندر پیدا ہوگا۔ سیاسی تحریکوں سے وابستہ افراد کی فکری اٹھان سیاسی انداز پر ہوتی ہے۔ اس لئے ان کے اندر جو اخلاق و کردار پیدا ہوتا ہے وہ بھی سیاسی انداز کا ہوتا ہے۔ ایک گروہ جس کے افراد کی فکری اٹھان سیاسی نظریات پر ہوئی ہو، ان کے اندر کسی تربیتی ضمیمہ کے ذریعہ غیر سیاسی کردار لایا نہیں جا سکتا۔

جماعت اسلامی سے وابستہ افراد کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ان کی فکری اٹھان اسلام کی سیاسی تعبیر پر ہوئی ہے۔ وہ جماعت اسلامی کی طرف اسی لئے راغب ہوئے کہ وہ اسلام کو سیاسی نظام کے روپ میں پیش کر رہی تھی۔ اس تحریکی عمل کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ ان کے اندر سیاسی مزاج اور سیاسی کردار ابھرے۔ جیسا کہ واقعۃً ہوا۔

اب یہ ناممکن ہے کہ کسی قسم کے تربیتی ضمیمہ کے ذریعہ ان لوگوں کے اندر روحانی یا غیر سیاسی کردار پیدا کیا جائے۔ جماعت اسلامی کے افراد کے موجودہ فکری ڈھانچہ کو باقی رکھتے ہوئے "تربیتی ضمیمہ" کے ذریعہ ان کے اندر روحانیت لانے کی کوشش کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص ببول کا درخت بوئے اور جب وہ بڑا ہو کر ببول کا پھل دینے لگے تو وہ چاہے کہ اس کی شاخوں میں آم کا پھل لٹکا کر اس کو آم کا درخت بنا دیا جائے۔

ایک تقابل

لارڈ میکالے (T.B. Macaulay) ۱۸۳۴ میں ہندستان آیا۔ سپریم کونسل آف انڈیا کے ایک اہم ممبر کی حیثیت سے اس نے وہ تعلیمی نظام شروع کیا جو بالآخر " انگریزی نظام تعلیم" کے نام سے پورے ملک میں رائج ہوگیا۔ اس نظام تعلیم کا مقصد، میکالے کے الفاظ میں یہ تھا کہ، اس کے ذریعہ سے ایک ایسی نسل تیار کی جائے جو پیدائش کے اعتبار سے ہندستانی مگر خیالات کے اعتبار سے انگریز ہو :

So that a generation may arise which will be
Indian in birth and English in thought

مسلمانوں کے تمام بے ریش اور باریش لیڈر (سر سید کے واحد استثنار کو چھوڑ کر) اس نظام تعلیم کے خلاف ہوگیے۔ وہ اس کی مخالفت میں تقریر کرنے لگے۔ کسی نے اس کو "قتل گاہ" کہا۔ کسی نے اس کے اوپر یہ شعر چسپاں کیا :

بچوں کے کبھی قتل سے بدنام نہ ہوتا افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

بیشتر لوگوں نے اس تعلیمی نظام میں شرکت نہیں کی۔ جو لوگ اس میں داخل ہوگیے تھے وہ درمیان ہی میں اس کو چھوڑ کر اس سے الگ ہوگیے۔ اس مخالفانہ پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان تعلیم کے میدان میں دوسری قوموں سے کم از کم دو سو سال پیچھے ہوگیے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے تمام مسائل کی جڑ ان کی یہی پسماندگی ہے۔ کیوں کہ تعلیم سے محرومی آدمی کو بے شعور بناتی ہے۔ اور جو لوگ بے شعور ہوں، اس دنیا میں ان کے لیے بربادی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

اب ایک اور تصویر دیکھئے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد ۱۹۴۵ میں جاپان کو امریکہ کے مقابلہ میں شکست ہوگئی۔ اس کے بعد امریکہ سیاسی، فوجی، انتظامی، ہر اعتبار سے جاپان پر قابض ہوگیا۔ اس شکست کے بعد جاپان نے اپنے آپ کو مکمل طور پر امریکہ کی ماتحتی میں پایا۔ امریکہ نے اس کے بعد جبری طور پر جاپان کو غیر مسلح کر دیا۔ جاپان کے نظام تعلیم میں انقلابی تبدیلیاں لائی گئیں۔ دسمبر ۱۹۴۵ میں امریکی جنرل میکارتھر نے تعلیمی انتظام کے متعلق وہ بنیادی ہدایات

جاری کیں جن کا خاص مقصد جاپان میں عسکریت کو اور جاپانی عوام کے قوم پرستانہ مزاج کو ختم کرنا تھا۔

جنگ کے زمانہ کے بہت سے ٹیچر ملازمت سے سبک دوش کر دیے گئے۔ مذہب اور سیاست کو مکمل طور پر ایک دوسرے سے الگ کر دیا گیا۔ شنٹو تعلیمات کو نصاب سے خارج قرار دیا گیا۔ ان تبدیلیوں کا مقصد یہ تھا کہ جاپان کی جدید نسل کو امریکہ کی پسند کے مطابق بنایا جائے۔ ۱۹۴۶ میں امریکہ کے تعلیمی ماہرین کی ایک ٹیم باقاعدہ منصوبہ کے تحت جاپان پہونچی۔ اس امریکی ٹیم نے ایک رپورٹ تیار کی جس کا نام حسب ذیل تھا :

Report of the United States Education Mission to Japan

یہ رپورٹ گویا ان ہدایات کی عملی تفصیل تھی جن کو جنرل میکارتھر نے جاپان کی وزارت تعلیم کے نام جاپان کے مقتدر اعلیٰ کی حیثیت سے جاری کیا تھا۔ ۱۹۴۷ میں جاپان کا بنیادی تعلیمی قانون اور اسکولی تعلیم کا قانون اسی کی مطابقت میں وضع کیا گیا۔ ۱۹۴۸ میں جاپان کا تعلیمی بورڈ بنایا گیا جس کا کام گویا اس بات کی نگرانی کرنا تھا کہ جاپان کا تعلیمی نظام امریکہ کی پسند کے مطابق جاری رہے۔ اس طرح جاپان میں اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی سطحوں پر جو تعلیمی نظام رائج ہوا وہ مکمل طور پر اس نظام کی نقل تھی جو امریکہ میں پہلے سے چل رہا تھا۔ (EB-6/392)

جاپانیوں نے، ہندستان کے مسلم رہناؤں کے برعکس، امریکہ کے اس منصوبہ کو "تعلیمی استعمار" بتا کر اس کے خلاف احتجاج اور بائیکاٹ کی تحریک نہیں چلائی۔ انھوں نے ایک دن ضائع کیے بغیر اپنی پوری نسل کو اس "امریکی تعلیمی نظام" میں داخل کر دیا۔

اب اس واقعہ پر تقریباً نصف صدی پوری ہو رہی ہے۔ اس کا جو نتیجہ ہوا وہ ساری دنیا کے سامنے ہے۔ امریکہ کے اس تعلیمی نظام میں پڑھ کر جو لوگ نکلے، وہ پورے معنوں میں جاپانی تھے۔ وہ کسی بھی اعتبار سے "امریکی" نہ بن سکے۔ جیسا کہ امریکہ انھیں بنانا چاہتا تھا۔ حتیٰ کہ انھوں نے امریکہ کی تمام امیدوں کے خلاف، جاپان میں ایک نیا انقلاب برپا کر دیا۔ انھوں نے جاپان کی ایک نئی تاریخ پیدا کر دی۔ انھوں نے ترقی کا ایک ایسا سیلاب جاری کیا جس کے بہاؤ میں خود امریکہ بھی ٹھہر نہ سکا۔ انھوں نے جاپان کو دنیا کی قوموں کے درمیان

اعلیٰ ترین صف میں کھڑا کر دیا۔

یہی موجودہ دنیا میں ترقی کا راز ہے۔ یہاں کامیابی اور ترقی اس کے لیے ہے جو ناموافق صورت حال کو موافق صورت حال میں تبدیل کر سکے۔ جو دشمن کے مخالفانہ منصوبوں کو اپنے لیے مفید خوراک بنا لے۔ جو اپنے "نہیں" کو اپنے "ہے" میں تبدیل کرنے کی اہلیت کا ثبوت دے۔ جو لوگ اس برتر صلاحیت کے حامل ہوں وہی مقابلہ کی اس دنیا میں کامیاب ہوتے ہیں۔ جو لوگ اس امتحان میں ناکام ہو جائیں۔ ان کے لیے اس کے سوا اور کچھ مقدر نہیں کہ تاریخ کے کوڑا خانہ میں پڑے ہوئے دوسروں کے خلاف احتجاج کرتے رہیں، ایسا احتجاج جس کو سننے کے لیے کوئی دوسرا وہاں موجود بھی نہ ہو۔

اس معاملہ میں جس طرح ہمارے ملک کا سیکولر طبقہ ناکام ثابت ہوا ہے، اسی طرح اسلام پسند طبقہ بھی ناکام ثابت ہوا ہے۔ مثال کے طور پر اکبر الٰہ آبادی اور ابو الاعلیٰ مودودی جیسے لوگوں نے انگریزی دور کی تعلیم گاہوں کو قتل گاہ بتایا اور ایک پوری نسل کو اس سے رد کنے کی کوشش کی۔

یہ احمقانہ حد تک بے معنی بات تھی۔ اسلام پسند رہنماؤں کے کرنے کا اصل کام یہ تھا کہ وہ مسلم نوجوانوں میں یہ شعور پیدا کریں کہ وہ انگریزی تعلیم گاہوں سے تعلیم کو لیں اور اس کی انگریزیت کو چھوڑ دیں۔ مگر اپنے سطحی فکر کی بنا پر انھوں نے منفی انداز اختیار کیا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی ایک پوری نسل تعلیمی اعتبار سے برباد ہو کر رہ گئی۔ اس معاملہ میں جاپان کے اہل کفر ہندستان کے اہل ایمان سے زیادہ عقلمند ثابت ہوئے۔

ایک صاحب نے گفتگو کے دوران بتایا کہ ڈکار میں دو ہزار مسجدیں ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا تمام مسجدیں آباد ہیں۔ انھوں نے پرمسرت لہجہ میں کہا: سنغالیون متدینون وھم متحمسون لدینھم الحنیف (سینیگال کے لوگ دین دار ہیں اور وہ اپنے دین میں پختہ ہیں)

ایک مرتبہ میں نے ڈکار کی ایک سڑک پر دیکھا کہ ایک فرانسیسی خاتون سڑک پر پیدل چل رہی ہے اور اس کی گود میں کتے کا ایک بچہ ہے جس کو وہ عین اسی طرح لئے ہوئے ہے جس طرح کوئی ماں اپنے بچہ کو اپنے سینہ سے چمٹائے ہوئے رہتی ہے۔ مغرب کی عورت نے انسانی بچہ کو گود میں لینا فیشن کے خلاف سمجھا۔ مگر اس کے بعد جو ہوا وہ صرف یہ کہ اس نے کتے کے بچے کو اپنی گود میں لے لیا۔ یہ دراصل فطرت کا تقاضا ہے جو عورت کو ایسا کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اس نے انسانی بچہ کو چھوڑا تھا مگر اس کے بعد فطرت نے اس کو حیوانی بچہ سنبھالنے پر مجبور کر دیا۔

روانگی سے پہلے دہلی میں میں نے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ڈکار (Dakar) کا صفحہ دیکھا۔ اس میں ایک نہایت خوب صورت عمارت کی تصویر بنی ہوئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ یہ صدارتی محل ہے جو سمندر کے کنارے بنا ہوا ہے۔ ۶ مئی کو شہر کے مختلف مقامات دیکھنے کے دوران مذکورہ "صدارتی محل" دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا۔ جب میں اس عمارت کے سامنے کھڑا تھا تو مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہی محل ہے جس کی تصویر میں نے دہلی میں کتاب میں دیکھی تھی۔ تصویر میں جو عمارت نہایت عظیم نظر آئی تھی، وہ حقیقی طور پر دیکھنے میں مقابلۃً معمولی نظر آنے لگی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ حقیقت کے مقابلہ میں تصویر ہمیشہ زیادہ عظیم دکھائی دیتی ہے۔ بیشتر لوگ اس فرق کو نہیں سمجھتے۔ اس لئے وہ تصویر کو حقیقت سمجھ کر اس کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ مگر جب وہ اس کو پالیتے ہیں تو وہ مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ اب انھیں معلوم ہوتا ہے کہ جو حقیقت انھوں نے پائی ہے وہ اس سے بہت کم ہے جو "تصویر" کی صورت میں انھوں نے پہلے دیکھی تھی۔

ایک بات یہ محسوس ہوئی کہ یہاں وہ بدعت نہیں ہے جو ہندستان اور پاکستان میں عام طور پر پائی جاتی ہے۔ یعنی مسلم ملکوں کی سیاسی رقابتوں کا اثر دینی حلقوں پر۔ وہاں ہر دینی حلقہ کسی ایک کا قصیدہ خواں بن کر دوسرے کے اوپر "لوم وشوم" کی لفظی بارش برسا رہا ہے۔ یہاں کے دینی لوگ سیاست سے قطع نظر کرتے ہوئے، ہر مسلم ملک سے یکساں تعلق قائم رکھے ہوئے ہیں۔ مثلاً ڈکار

میں ایک اسلامی مرکز عراق کے تعاون سے بنا ہے، اگرچہ ابھی وہ ناتمام ہے۔ شیخ عبد العزیز مسی نے یہاں مجھے ایک مسجد دکھائی جو پہلے خستہ تھی، اب وہ شاندار طور پر بنی ہوئی کھڑی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس مسجد کی تعمیر نو کی ضرورت تھی۔ چنانچہ میں سعودی عرب گیا، وہاں مجھے کافی مدد ملی۔ اس سے میں نے یہ مسجد تعمیر کرائی۔ اسی طرح ایک اور اسلامی ادارہ ہے جو لیبیا کے تعاون سے بنایا گیا ہے۔ دینی حلقوں کے لئے یہی انداز زیادہ مناسب ہے۔

یہ ہوٹل دس منزلہ ہے۔ اس اعتبار سے اس کی لفٹ میں ایک سے لے کر دس تک نمبر لگے ہوئے ہیں۔ ہر آدمی اپنا مطلوبہ نمبر دبا کر اپنی مطلوبہ منزل پر پہنچ جاتا ہے۔

ایک روز لفٹ میں جاتے ہوئے مجھ پر ایک تجربہ گزرا۔ میں لفٹ کے اندر داخل ہوا تو میرے ساتھ تین آدمی اور بھی آگئے۔ کسی کو نویں منزل پر جانا تھا، کسی کو دسویں منزل پر۔ ان لوگوں نے سبقت کرکے اپنا اپنا نمبر دبا دیا۔ بورڈ پر نمبر ۹ اور نمبر ۱۰ کی گنتیاں روشن ہوگئیں۔ مجھے نمبر ۲ پر جانا تھا۔ میں نے بعد کو اپنا بٹن دبا دیا۔ بٹن دبانے کی ترتیب کے لحاظ سے بظاہر لفٹ کو پہلے نویں اور دسویں منزل پر جانا چاہئے تھا۔ مگر لفٹ نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے پہلے مجھ کو دوسری منزل پر اتارا۔ اس کے بعد وہ نویں اور دسویں منزل کے مسافروں کو اتارنے کے لئے اوپر گئی۔

اونچی بلڈنگوں کے لئے یہ روزمرہ کا عام واقعہ ہے۔ لوگ اس کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ اس پر غور کریں۔ مگر میرا ذہن فوراً ٹھٹک گیا۔ میں نے سوچنا شروع کیا کہ لفٹ نے ایسا کیوں کیا کہ اس نے بٹن دبانے کی بے ترتیبی کو بطور خود درست کیا اور صحیح ترتیب کے ساتھ مسافروں کو ان کی منزل پر پہنچایا۔ میرے ذہن نے جواب دیا کہ اس کا سبب کمپیوٹر ہے۔ موجودہ زمانہ کی آٹومیٹک لفٹ کے ساتھ کمپیوٹر لگا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اپنے "مشینی دماغ" کے ذریعہ بے ترتیبی کو ترتیب میں بدلتا ہے۔ وہ لفٹ کو "حکم" دیتا ہے کہ بے ترتیب طور پر بٹن دبائے جانے کے باوجود وہ اپنے مسافروں کو حقیقی ترتیب کے ساتھ ان کی منزل پر اتارے۔

اس دنیوی منظر کو دیکھ کر اچانک میرا ذہن آخرت کی طرف چلا گیا۔ میں نے کہا کہ یہی واقعہ جو مخلوق کی سطح پر ابتدائی درجہ میں پیش آرہا ہے، یہی آئندہ خالق کی سطح پر کامل درجہ میں پیش آئے گا۔

موجودہ دنیا میں بظاہر حقیقی ترتیب بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ کہیں اول درجہ کا آدمی پیچھے ہے اور تیسرے درجہ کا آدمی آگے۔ اہل شخص بے زبان بنا ہوا ہے اور نااہل لوگ اخبار اور اسٹیج پر نمایاں ہو رہے ہیں۔ مستحق لوگ ناداری میں پڑے ہوئے ہیں اور غیر مستحق افراد ہر قسم کے وسائل پر قابض ہیں۔ یہ گویا مصنوعی ترتیب ہے جو موجودہ دنیا میں قائم ہوگئی ہے۔ آخرت میں خدا ظاہر ہو کر اس ترتیب کو ختم کر دے گا۔ وہ نمبر ایک کو نمبر ایک پر کر دے گا اور بقیہ نمبر والوں کو ان کے حقیقی نمبر کی طرف جانے پر مجبور کر دے گا۔

کھانے کے وقت ایک بار سینیگال کے ایک صاحب میری میز کی دوسری طرف تھے۔ انھوں نے اپنے ملک کے بارہ میں بہت سی باتیں بتائیں۔ ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ یہاں ایک درخت پایا جاتا ہے۔ اس کی پتی کو چائے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف ایک مشروب ہے بلکہ وہ نہایت مفید ہے (اوراق تغلی وتشرب کالشای وھی مفیدۃ جدا)

مشہور ہے کہ ایک شخص نازک بیماری میں مبتلا تھا۔ علاج سے وہ اچھا نہیں ہوا۔ ایک روز وہ گھبرا کر بستی کے باہر چلا گیا اور اس نے مذکورہ درخت کی بہت سی پتی کھالی۔ اگلے دن اسے اپنے مرض میں افاقہ محسوس ہوا۔ اس کے بعد وہ مزید کچھ دنوں تک اس کی پتی کھاتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ بالکل تندرست ہوگیا۔ یہ قصہ مشہور ہوا تو لوگ اس درخت کی پتی کو مختلف صورتوں میں استعمال کرنے لگے۔ اب اس کی مقبولیت کی بنا پر ایسے کارخانے بن گئے ہیں جہاں اس کی پتی کو پروسس کیا جاتا ہے اور اس کو پیک کر کے چائے کی طرح سپلائی کیا جاتا ہے۔ کھانے کے بعد میرے ساتھی نے کافی منگائی۔ مگر میں نے اس مقامی مشروب کا آڈر دیا۔ یہ کافی لطیف اور مفید تھا۔ میں جب تک یہاں رہا میں اس کو پیتا رہا۔ اس کا نام کِن کل با (Kinkelibah) ہے۔ اس کے پیکٹ پر حسب ذیل پتہ لکھا ہوا تھا:

Enterprise Senegalaise de, B.P. 10.101,
Ouagou Niayes, Dakar, Senegal, West Africa.

محمد مصطفیٰ سی (مفتش فی تعلیم اللغۃ العربیۃ) نے بتایا کہ سینیگال میں عیسائی اگرچہ بہت کم ہیں۔ پانچ فیصد سے بھی کم۔ مگر یہاں چرچ بہت منظم ہے۔ یہاں کے بہترین اسکول اور اسپتال انھیں لوگوں نے قائم کر رکھے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی بہت کوششیں کرتے ہیں۔ مگر اس میں وہ کامیاب نہیں۔

دوسری طرف مسیحی (ان کے غریب طبقہ کے لوگ)، برابر مسلمان ہوتے رہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے آج ہی ایک مسیحی کو مسلمان بنایا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق، یہ مسیحی کسی تبلیغ کے بغیر اپنے آپ مسلمان ہوتے رہتے ہیں۔

ہوٹلوں میں طرح طرح کی چیزیں کھانے کے لئے ہوتی ہیں۔ یہاں بھی یہی صورت حال تھی۔ مگر صبح کو اکثر میں ہنی پاپ (honey pops) لیا کرتا تھا۔ ۷ مئی کی صبح کو ناشتہ کے لئے ہوٹل کے طعام خانہ میں گیا تو وہاں ہنی پاپ کا ڈبہ دکھائی نہیں دیا۔ وہاں جو ڈبے رکھے ہوئے تھے ان پر ہنی پاپ کے بجائے میل پاپ (miel pops) لکھا ہوا تھا۔ میرے تجسس کو دیکھ کر ہوٹل کا آدمی قریب آیا۔ اس نے کہا آپ کیا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آج یہاں ہنی پاپ کے ڈبے نہیں ہیں۔ اس نے کہا کہ یہ میل پاپ وہی چیز ہے۔ میل (miel) فرانسیسی زبان میں شہد (honey) کو کہتے ہیں۔

میں نے سوچا کہ اسی طرح اکثر آدمی لفظوں سے دھوکہ کھاتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی "مذہب امن" کی تلاش میں ہے۔ اب آپ اس کے سامنے "اسلام" پیش کرتے ہیں۔ وہ اس کو اپنے ذہنی تصور کے مطابق کوئی دوسری چیز سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے۔ حالاں کہ اگر وہ حقیقت حال سے واقف ہو تو اس کو معلوم ہوگا کہ مذہبِ امن کے نام سے وہ جس چیز کی تلاش میں ہے وہ عین وہی چیز ہے جس کا نام اسلام ہے۔ اگرچہ مسلمانوں نے اپنا قومی لیبل لگا کر اس کی ظاہری صورت مشتبہ بنا دی ہے۔

سینیگال کے ایک صاحب نے بتایا کہ اس ملک میں اسلام گیارہویں صدی عیسوی میں آیا ہے۔ یعنی صحابہ کے دور کے بعد۔ یہاں کے مسلمان عام طور پر نہایت سادہ مزاج ہوتے ہیں۔ ان میں اکثر فطری اوصاف زندہ ہیں۔ مثلاً انھوں نے بتایا کہ کوئی سینیگالی اپنے وطن سے باہر ملک کی کسی دوسری بستی میں جائے تو وہاں وہ کبھی ہوٹل میں نہیں ٹھہرتا۔ کیوں کہ مقامی لوگ اس کو اپنا مہمان بنانا پسند کرتے ہیں۔ ہوٹلوں میں زیادہ تر باہر کے لوگ ٹھہرتے ہیں۔ ایک سینیگالی کھانا کھا رہا ہو تو اس وقت اس کو جو شخص بھی ملے وہ بے تکلف اس کو کھانے میں شریک کرے گا۔

میں نے اپنے کمرہ میں کھڑے ہو کر سمندر کی طرف دیکھا۔ حد نظر تک سمندر کا پانی موجیں مار رہا تھا اور اس سے ایک قدرتی موسیقی فضا میں بلند ہو رہی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ آج کا زمانہ معلومات کے اعتبار سے، قدیم زمانہ سے کتنا مختلف ہے۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ زمین کا آدھا حصہ خشکی ہے

اور آدھا حصہ پانی۔ یہ اس خیال کا اعادہ ہے جو حکما یونان کے زمانہ سے ابن خلدون تک چلا آرہا تھا۔ مگر آج اسکول کا ایک طالب علم بھی جانتا ہے کہ نصف نصف کا یہ نظریہ درست نہیں۔ اصل یہ ہے کہ ہماری زمین کی سطح کے ۷۱ فی صد حصہ پر سمندر کا پانی پھیلا ہوا ہے اور بقیہ ۲۹ فی صد حصہ خشکی ہے۔

اس معلوماتی فرق کی بنا پر کچھ ترقی پسند لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اب انسان کو نئے مذہب کی ضرورت ہے۔ مگر یہ ایک لغو بات ہے۔ کیوں کہ مذہب کا تعلق اس مسئلہ سے نہیں ہے کہ زمین پر خشکی اور تری کا تناسب ۵۰۔۵۰ فیصد ہے یا ۷۱۔ ۲۹ فی صد۔ اس قسم کی معلومات کی کوئی حد نہیں۔ انسان نے جتنا آج جانا ہے، اس سے بہت زیادہ وہ ہے جس کو وہ ابھی تک جان نہ سکا۔ مثلاً بلیک ہول کا نظریہ بتاتا ہے کہ کائنات کا صرف تین فیصد انسان کے لئے قابل مشاہدہ ہے، بقیہ ۹۷ فیصد حصہ انسان کے لئے قابل مشاہدہ نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب کا انحصار اس قسم کی معلومات پر نہیں ہے۔ مذہب کا اصل مقصد یہ ہے کہ آدمی خدا کی خالقیت اور مالکیت کو تسلیم کرکے اس کے آگے جھک جائے۔ اس اعتبار سے ہر دور کا مذہب صرف ایک ہے، اس میں زمانہ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔

سینیگال کے عام لوگ مقامی بولی (اُلف) میں بات کرتے ہیں۔ تعلیم یافتہ لوگ یا فرنچ بولتے ہیں یا عربی زبان۔ یہ زبانوں کا فرق بھی بڑا عجیب ہے۔ مثلاً ہوٹل کے آدمی کو کلمہ ترحیب اگر اردو میں کہنا ہو تو وہ کہے گا کہ ہم نوووٹل میں آپ کا استقبال کرتے ہیں۔ اس بات کو انگریزی اور فرنچ میں اس طرح کہا جائے گا:

We welcome you in Novotel. (English)
Nous vous souhaitons la bienvenve Novotel (French)

ایک مرتبہ میں سوچنے لگا کہ اگر ساری دنیا کی زبان ایک ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ پھر سمجھ میں آیا کہ کئی زبان ہونا ہی زیادہ بہتر ہے۔ کیوں کہ اس سے مسابقت کی تحریک ہوتی ہے اور ہر ایک آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور جب کسی آدمی میں آگے بڑھنے کا جذبہ ابھرتا ہے تو وہ صرف ایک معاملہ تک محدود نہیں رہتا۔ وہ زندگی کے دوسرے معاملات میں بھی اپنے آپ اپنا اثر ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً

ابتدائی دور کے مسلمانوں میں اولاً کتابت قرآن اور تدوین حدیث کے لئے علم کا جذبہ ابھرا۔ مگر جب علم کا جذبہ ابھر آیا تو پھر اس نے دوسرے تمام علوم میں بھی مسلمانوں کو آگے بڑھا دیا۔

انیسویں صدی کے کچھ مغربی مفکرین نے ایک معاشی یوٹوپیا بنانا چاہا جہاں ہر ایک کو برابر برابر رزق مل رہا ہو۔ یہ فرضی سوسائٹی موجودہ دنیا میں محال ہے کیونکہ وہ تخلیق کے نظام سے ٹکراتی ہے۔ تاہم اگر بالفرض ایسا سماج بن جائے تو تمام ترقیاں ٹھپ ہو کر رہ جائیں گی۔ کیونکہ ترقی کا جذبہ ہمیشہ "فرق" کو دیکھ کر ابھرتا ہے اور جب فرق ہی باقی نہ رہے تو ترقی کا جذبہ کیوں کر پیدا ہو گا۔

ایک بار ہوٹل کے لاونج میں کچھ افریقی مقامی زبان میں بات کر رہے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس کے بعد ہوٹل کے باہر نکلا تو جھاڑی میں ایک بلی تھی۔ اس نے "میاؤں میاؤں" کی آواز نکالی۔ اچانک خیال آیا کہ جانور تمام دنیا میں ایک ہی انداز پر بولتے ہیں۔ کوئی جانور جس طرح ہندستان میں بولتا ہے، ٹھیک اسی طرح وہ یورپ اور افریقہ میں بھی بولتا ہے۔ مگر انسان کی بولیاں الگ الگ ہیں۔ حتی کہ دنیا بھر میں ان کی کئی ہزار بولیاں ہو گئی ہیں۔

پھر خیال آیا کہ یہ انسان کے حالتِ امتحان میں ہونے کا ایک پہلو ہے۔ جانوروں کا کوئی امتحان نہیں۔ اس بنا پر ان کی ہر نوع کے لئے ایک ہی بولی مقرر کر دی گئی۔ مگر انسان اس امتحانی میزان پر کھڑا کیا گیا ہے کہ وہ خود اپنے ارادے سے متحد ہو۔ وہ اختلاف کے باوجود اتحاد کا ثبوت دے۔ جانوروں سے امتحان مطلوب نہ تھا، اس لئے انھیں ازاول تا آخر حالتِ اتحاد میں رکھا گیا۔ اس کے برعکس انسان سے امتحان مطلوب تھا۔ اس لئے انھیں حالت اختلاف میں ڈال دیا گیا۔ اور پھر کہا گیا کہ تم اپنے اختلاف کو نظر انداز کرتے ہوئے اتحاد کا ثبوت دو۔

الشیخ عبد العزیز سی (عمر ۶۳ سال) یہاں کی ممتاز دینی شخصیت ہیں۔ ان کی مادری زبان اگرچہ اُلف ہے۔ مگر وہ روانی کے ساتھ عربی بولتے ہیں۔ انھوں نے "تجول" کی پیش کش کی۔ چنانچہ ان کے ساتھ شہر گھومنے کے لئے نکلا۔

دکار کی سڑکیں نہایت عمدہ ہیں۔ ان کے دونوں طرف عمارتیں زیادہ تر فرانسیسی طرز کی نظر آتی ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ سڑکیں غالباً فرانسیسیوں نے اپنے دور اقتدار میں بنائی تھیں۔ انھوں نے

فوراً کہا: نعم ولکن بعد الاستقلال قمنا بالتجدید (ہاں، مگر آزادی کے بعد ہم نے ان کی تجدید کی ہے)

چلتے ہوئے ہم ڈکار کی سب سے بڑی مسجد جامع میں پہنچے۔ مگر وہ مکمل طور پر بند تھی۔ دروازہ پر تالا لگا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہاں عام مسجدوں میں پانچ وقت کی نماز ہوتی ہے اور وہ کھلی رہتی ہے۔ مگر " جوامع " صرف نماز جمعہ کے لئے ہوتی ہیں۔ جمعہ کی نماز کے بعد وہ بند کر دی جاتی ہیں اور پھر اگلے جمعہ کو کھلتی ہیں (یغلق بعد صلاۃ الجمعۃ الی جمعۃ الآخر) اسی طرح ایک اور بڑی مسجد پر پہنچے تو وہاں بھی تالا لگا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ بھی جامع مسجد ہے اور وہ ہفتہ میں ایک بار صرف جمعہ کی نماز کے لئے کھولی جاتی ہے۔ یہ بات پہلی بار صرف یہاں دیکھی۔

کئی عام مسجدیں دیکھیں۔ ایک کا نام مسجد السید الحاج مالک سی تھا۔ یہ مسجد پہلی عالمی جنگ سے پہلے ۱۹۰۹ میں بنائی گئی تھی۔ پوری مسجد ایک بڑے ہال کی مانند تھی۔ سامنے خوبصورت انداز میں امام کے لئے کھڑے ہونے کی جگہ بنی ہوئی ہے۔ مسجد کا یہ انداز مجھے بہت پسند ہے۔

ایک بڑی دینی درس گاہ دیکھی۔ اس کا نام المعہد الاسلامی (ڈکار) تھا۔ اس وقت وہاں تعطیل تھی۔ تاہم عمارت کھلی ہوئی تھی۔ اس لئے اندر تک پورا حصہ دیکھا۔ اس کا طرز تعمیر بالکل مسلم اسپین کے انداز کا ہے۔

راستہ میں ایک مقام پر بہت بڑی عمارت نظر پڑی جو نامکمل تھی۔ میرے ساتھی نے بتایا کہ یہ مرکز عراق کے تعاون سے بن رہا تھا اور خود صدر صدام حسین نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔ مگر اس کے بعد ایران عراق جنگ چھڑ گئی۔ اس بنا پر اس کی عمارت مکمل نہ ہو سکی۔ یہ مرکز میری نظر میں اس اصول کی ایک مثال تھا کہ : ایک کام کرنے کے لئے آدمی کو دوسرا کام چھوڑنا پڑتا ہے۔ آدمی کے وسائل ہمیشہ محدود ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ تعمیر اور تخریب دونوں کام ساتھ ساتھ کر سکے۔ ایران اور عراق دونوں اس اصول کے زندہ نمونے ہیں۔

الشیخ عبدالعزیز سی ڈکار شہر دکھاتے ہوئے آخر میں مجھ کو سمندر کے کنارے کی سڑک سے واپس لائے۔ ایک طرف سمندر کی موجیں تھیں۔ دوسری طرف سڑک کے کنارے دور تک سفیروں کے خوبصورت مکانات تھے۔ چکنی سڑک پر آٹومیٹک کار نہایت ہموار انداز سے چلی جا رہی تھی۔ مگر اتنی دیر میں میرے

سر میں درد شروع ہو چکا تھا۔ میرا یہ حال نہایت عجیب ہے۔ میرے وجود میں غم اتنا سرایت کئے ہوئے ہے کہ میں کسی بھی چیز سے محظوظ نہیں ہو سکتا۔ اپنی کمزوریوں اور نااہلیوں کے بارہ میں سوچتا ہوں تو اکثر میری زبان پر فارسی کا یہ مصرعہ آجاتا ہے :

در حیرتم کہ دہقاں بہ چہ کار کشت مارا

ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ افغانی سے ملاقات ہوئی۔ وہ اب یورپ میں رہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ آجکل اکثر تعلیم یافتہ افغانی بیرونی ملکوں میں چلے گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ افغانستان کا اصل مسئلہ روسیوں کا افغانستان میں آنا نہیں ہے، بلکہ تعلیم یافتہ افغانیوں کا افغانستان سے چلا جانا ہے۔ انھوں نے کہا کہ روسی جارحیت کی بنا پر ایسا ہوا۔ میں نے کہا کہ ایسا کہنا درست نہیں۔ کیوں کہ اسی قسم کا واقعہ پاکستان میں بھی ہوا ہے، جب کہ پاکستان میں کوئی بیرونی جارحیت نہیں ہوئی۔ پاکستان مسلم ہوم لینڈ کے طور پر بنا۔ مگر جب پاکستان بن گیا تو وہاں کے بیشتر اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد بیرونی ملکوں میں چلے گئے۔

میں نے کہا کہ اس ترک وطن کی اصل وجہ سیاسی نہیں بلکہ اقتصادی ہے۔ افغانستان یا پاکستان کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ اس لئے باہر کے ملکوں میں چلے گئے کہ ان کے لئے اپنے ملک کے مقابلہ میں غیر ملک میں اقتصادی مواقع زیادہ تھے۔ ہمارے تمام رہنما سو برس سے بھی زیادہ عرصہ سے سیاسی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ تھی کہ وہ اقتصادی ترقی کے لئے جدوجہد کرتے۔ کیوں کہ اقتصادی ترقی کے بغیر سیاسی آزادی بے معنی ہے۔

جنوبی افریقہ کے ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ ایک پادری سے میری بحث ہوئی۔ پادری نے ایسا سوال کیا جس کا میں جواب نہ دے سکا۔ پادری نے مجھ سے پوچھا کہ آپ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ پیغمبر غلطی نہیں کرتا۔ میں نے کہا ہاں۔ پھر اس نے کہا کہ آپ آدم کو پیغمبر مانتے ہیں۔ میں نے کہا ہاں۔ پھر اس نے کہا کہ خود آپ کے قرآن کے بیان کے مطابق، آدم نے جنت میں ممنوعہ پھل کھایا اور غلطی۔ میں کنفیوژن میں پڑ گیا۔ میری سمجھ میں کچھ جواب نہیں آیا۔

میں نے کہا کہ ہمارا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ پیغمبر غلطی نہیں کرتا۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ پیغمبر غلطی پر قائم نہیں رہتا۔ اگر آپ پادری کے سوال پر پہلے ہی اس کی وضاحت کر دیتے تو اس کا اعتراض اپنے

آپ ختم ہوجاتا۔

ڈاکٹر اسماعیل عبد الحلیم (عمر ۵۰ سال) لندن میں رہتے ہیں۔ لندن کے مسلمانوں کے حالات بتاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ وہاں مسلمانوں میں سب سے زیادہ برصغیر ہند کے لوگ رہتے ہیں۔ ساؤتھ ہال میں ہندستانی، بریڈفورڈ میں پاکستانی اور ایسٹ اینڈ میں بنگلہ دیشی۔ یہ لوگ یہاں اپنے انھیں رواجوں اور انھیں عادتوں کے ساتھ رہتے ہیں جو وہ اپنے ملک سے لے آئے ہیں۔

میں نے کہا کہ پھر انگریز انھیں ناپسند نہیں کرتے۔ انھوں نے کہا کہ انگریزوں میں ٹالرنس غیر معمولی حد تک پایا جاتا ہے۔ عرب ان کے اس مزاج کو البرودة الانجلیزیہ کہتے ہیں۔ انگریز کبھی آپ سے یہ نہیں کہے گا کہ وہ آپ کو پسند نہیں کرتا۔ یا یہ کہ تم اپنے ملک کو واپس چلے جاؤ، خواہ وہ آپ کے اوپر کتنا ہی زیادہ غصہ کیوں نہ ہو (لا یقول الانجلیزی انہ لا یحبک او علیک ان ترجع الی بلدک مہما کان ھو غاضباً علیک)

یہی تحمل قوموں کی ترقی کا راز ہے۔ جو قوم تحمل اور برداشت کی صفت کھو دے، وہ موجودہ دنیا میں کبھی اعلیٰ ترقی نہیں کر سکتی۔

طارق الکرذی ایک عرب نوجوان ہیں۔ وہ ڈبلن (یورپ) میں رہتے ہیں۔ ان کے ایک واقف کار نے بتایا کہ وہ وہاں اسلامی مرکز کے طرز پہ باقاعدہ دعوت کا کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے دو چھپے ہوئے انگریزی پمفلٹ مجھے دئے۔ یہ میرے دو مضامین کے انگریزی ترجمے تھے۔ ان کو چھاپ کر وہ وہاں تقسیم کر رہے ہیں۔ ان کے عنوانات یہ ہیں:

1. What is Islam
2. Islam in the 21st Century

ایک اور صاحب جو بحرین سے تعلق رکھتے تھے، انھوں نے بحرین کا عربی مجلہ الھدایۃ (جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ ھ، دسمبر ۱۹۸۹) دیا۔ یہ مجلہ بحرین کی وزارۃ العدل والشئون الاسلامیۃ کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔ مذکورہ شمارہ میں راقم الحروف کی کتاب "تجدید دین" کے عربی اڈیشن کا مفصل تعارف " تجدید علوم الدین " کے عنوان سے چھپا ہے۔ تبصرہ نگار ڈاکٹر کارم السید غنیم ہیں۔ آٹھ صفحہ کے مفصل تعارف کے بعد آخر میں لکھتے ہیں: ختاماً فاننانری الکتاب الحالی من

الاهمية بمكان عظيم ويتوجب على كل مسلم غيور ان يتعرف على ماجاء فيه (صفحہ ۱۷)

الرسالہ مشن کی جتنی مخالفت کی گئی، اتنی شاید موجودہ زمانہ میں کسی بھی تحریک کی مخالفت نہیں کی گئی۔ اس کے باوجود یہ اللہ کا فضل ہے کہ یہ مشن ہندستان، پاکستان، عرب ممالک اور مغربی ممالک میں پھیل گیا۔ اور اب ان شاء اللہ کسی کی مخالفت اس فکری سیلاب کو روکنے میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔

ڈاکٹر اسماعیل عبد الحلیم مالیزیا (سلانگور) کے رہنے والے ہیں۔ اس وقت وہ لندن میں ایک کالج سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں جولائی ۱۹۹۰ میں اپنے وطن واپس چلا جاؤں گا۔ ہمارے یہاں حکومت میں امور مذہبی کا ایک شعبہ ہے۔ اس میں مجھے کام کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں مجھے مشورہ دیجئے کہ مالیزیا پہنچ کر میں کس طرح مسلمانوں کی اسلامی تعلیم و تربیت کا کام کروں۔

گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ ایک صورت یہ ہے کہ مسلمانوں میں زکوٰۃ کا نظام رائج کیا جائے۔ میں نے کہا کہ آپ زکوٰۃ کے نفاذ سے اپنے کام کا آغاز نہ کریں۔ یہ طریقہ ضیاء الحق صاحب کے زمانہ میں پاکستان میں ناکام ہوچکا ہے۔ موجودہ صورت میں زکوٰۃ ایک مسلمان کو دوہرا ٹیکس معلوم ہوتی ہے۔ پھر وہ کیسے اس پر راضی ہوسکتا ہے۔ اس کے جواب میں انھوں نے جو کچھ کہا وہ میرے لئے نئی بات تھی۔ انھوں نے کہا کہ مالیزیا میں زکوٰۃ کی اداشدہ رقم کو ملکی ٹیکس میں محسوب کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے وہاں دوہرا ٹیکس کی صورت نہیں پیدا ہوتی:

المسلم في ماليزيا عليه ان يدفع ضريبة الدخل السنوي وزكاة المال اذا كان غنيا۔ واذا دفع المسلم زكوٰة المال التي عليه فله الحق قانونيا أن يقول للحكومة عليك ان تحسب هٰذا المبلغ الذي دفعته باسم الزكاة، هو في حد ذاته جزء من ضريبة الدخل حقي.

حسب پروگرام ۷ مئی کی شام کو کانفرنس کا افتتاح ہوا۔ یہ افتتاح صدر مملکت عبدہ ضیوف نے کیا۔ یہ پروگرام یہاں کے سب سے بڑے ہال میں کیا گیا تھا۔ وسیع ہال مکمل طور پر بھرا ہوا تھا۔ کثیر تعداد میں لوگ ہال کے باہر موجود تھے۔ یہاں اکثر پروگراموں میں میں نے دیکھا کہ عوام ہزاروں کی تعداد میں اکٹھا ہیں۔ عام طور پر اس طرح کی کانفرنسوں میں محدود تعداد میں صرف علماء اور دانشور

شریک ہوتے ہیں ۔ مگر یہاں عوامی شمولیت کا منظر نظر آیا۔

میں نے سنا تھا کہ صدر عبدہ ضیوف افریقہ کے سب سے زیادہ لمبے آدمی ہیں۔ میرے ذہن میں ان کی تصویر کچھ اس طرح تھی کہ وہ جب آئیں گے تو تمام شرکا، باعتبار قد چھوٹے نظر آنے لگیں گے۔ ان کا قد کچھ لمبا ضرور ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قد کے بارہ میں جو شہرت ہے وہ " بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کے لئے " کے اصول کے تحت عمل میں آئی ہے۔

افتتاح رسمی انداز کا تھا۔ تاہم اس کی ایک چیز نے مجھ کو بہت متاثر کیا۔ اس افتتاح میں قرآن کی تلاوت ایک افریقی بچہ نے کی۔ اس کی عمر گیارہ سال تھی اور اس کا نام علی حرازم تھا۔ بظاہر دیکھنے میں اس کا چہرہ اور اس کی شخصیت نہایت غیر جاذب تھی۔ مگر اس نے جب قرآن کی تلاوت کی تو وہ اتنی موثر تھی کہ آنکھوں میں آنسو نکل آئے۔ میں نے سوچا کہ قرآن کی صورت میں مسلمانوں کو کتنی بڑی طاقت حاصل ہے۔ قرآن کے ذریعہ ایک بےحقیقت آدمی اپنے کو باحقیقت بنا سکتا ہے۔

کانفرنس کے ایجنڈے میں دو چیزیں میری خاص دل چسپی کی تھیں :

الدعوة الاسلامية ومتغيرات العصر

المستجدّات والتطورات في العالم والعالم الاسلامي

اس موضوع پر لوگوں نے جو اظہار خیال کیا، اس سے اندازہ ہوا کہ لوگوں کے ذہنوں پر زیادہ تر سیاسی تبدیلیوں یا سیاسی نوعیت کے واقعات کا اثر ہے۔ مثلاً یہ کہ روس اور امریکہ (سپر پاورس) نے آپس میں مفاہمت کر لی ہے۔ اس کے نتیجہ میں عالمی سیاست میں زبردست قسم کی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ بہت سے ممالک جن کو امریکہ اپنی سرپرستی میں لئے ہوئے تھا، تاکہ ان کو روسی نفوذ سے بچا سکے، اب اس نے ان سے اپنی سرپرستی واپس لے لی ہے۔ کیوں کہ نئی پالیسی نے سرد جنگ یا گرم جنگ کا خاتمہ کر دیا۔ اسی میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ امریکہ جو اس سے پہلے مجاہدین کی زبردست مدد کر رہا تھا، اب اس نے اپنی مدد روک دی ہے۔ یہی خاص وجہ ہے جس کی بنا پر نجیب حکومت کے خلاف افغانی مجاہدین کی مہم اچانک بے اثر ہو کر رہ گئی ہے۔

شرکا کی طرف سے اس قسم کے بہت سے مسائل کا ذکر کیا گیا۔ میں نے کہا کہ بلاشبہہ نئے حالات نے کچھ نئے سیاسی مسائل مسلمانوں کے لئے پیدا کئے ہیں۔ مگر اس کا اس سے بھی زیادہ بڑا پہلو یہ ہے کہ

ان تبدیلیوں نے جدید تاریخ میں پہلی بار اسلامی دعوت کے نئے مواقع کھول دئے ہیں۔

مثلاً سوویت روس میں اس سے پہلے مذہب پر مکمل پابندی لگی ہوئی تھی۔ وہاں کارل مارکس کا یہ کلمہ دہرایا جارہا تھا کہ "مذہب عوام کی افیون ہے"۔ مگر آج روس کے دانشور اعلان کر رہے ہیں کہ خود مارکسزم ایک مزید بدترقسم کی ذہنی افیون تھی جس کو مارکس نے ایجاد کیا۔ اور وہ اس قابل ہے کہ اس کو دفن کر دیا جائے۔ اس سے پہلے روس کے علاقہ میں قرآن کا کوئی نسخہ لے جانا قانوناً ممنوع تھا۔ آج خود ایروفلاٹ قرآن کے دس لاکھ نسخے جدہ سے ماسکو پہنچا رہی ہے۔ وغیرہ

میں نے کہا کہ ایسی حالت میں ہم کو چاہئے کہ مشکلات و مسائل کو نظر انداز کرتے ہوئے نئے دعوتی مواقع کو استعمال (avail) کریں۔

شیخ محمود احمد کفتارو (دمشق) نے اپنی تقریر میں ایک مسیحی مبلغ کا قول نقل کیا۔ اس نے کہا کہ مسلم دنیا کے بعض علاقوں میں ہماری تبلیغی کوششیں کسی حد تک کامیاب ہوئی ہیں جہاں کہ اسلام کا دائرۂ اثر گھٹنا شروع ہو گیا تھا۔ مگر حیرت ناک بات یہ ہے کہ اسلام اچانک خود ہمارے اپنے گھر کے اندر پھیلنے لگا (نجحنا نسبياً بالتبشير في بعض نواحي العالم الاسلامي حيث بدء الاسلام ينحسر ولكننا فوجئنا بالاسلام في عقر دارنا ينتشر)

اسلام اور دوسرے مذہبوں کا فرق یہ ہے کہ دوسرے مذاہب نے تبدیلی اور تحریف کی بنا پر اپنی اصل حیثیت کھو دی ہے۔ مگر اسلام اپنی فطری صورت پر قائم ہے۔ دوسرے مذاہب کی طرف جب انسان کو لانے کی کوشش کی جاتی ہے تو انسان اپنی فطری طلب اور موجودہ مذہب میں مطابقت نہیں پاتا۔ اس کے برعکس انسان جب اسلام سے متعارف ہوتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اسلام عین اس کی فطرت کے مطابق ہے۔ وہ فوراً اسلام کو اپنا لیتا ہے۔

بعض لوگ اپنے ذاتی مذہب پر چلتے ہیں اور اس کو اسلام کی اصطلاحوں میں بیان کرتے ہیں۔ اس قسم کی مثالیں یہاں بھی سامنے آئیں۔ مثلاً ایک صاحب نے کہا کہ تقویٰ کا مطلب یہ ہے کہ عوام کو متحرک کیا جائے:

Taqwa is to mobilize the people

میں نے اس کی مزید تشریح پوچھی تو اس کے جواب میں انھوں نے جو تقریر کی اس کے الفاظ سب کے سب

میرے لئے معلوم الفاظ تھے۔ مگر میں کچھ بھی سمجھ نہ سکا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

تفسیر اسلام اور تعبیر دین کا یہ طریقہ مشہور مسلم رہنماؤں کے یہاں بھی مکمل طور پر موجود ہے۔ مثلاً سفر سے پہلے میں نے سید ابو الاعلیٰ مودودی کی کتاب "جہاد فی سبیل اللہ" پڑھی۔ یہ کتاب اردو میں تھی۔ مگر پوری کتاب میرے لئے ناقابل فہم تھی۔ کیوں کہ اس کتاب میں خطابت اور انشا پردازی تو ضرور تھی، مگر دلیل کی نوعیت کی کوئی چیز اس میں میں نے نہیں پائی۔ اس کتاب میں جن آیتوں یا حدیثوں سے مصنف نے اپنا انقلابی نقطۂ نظر نکالا ہے وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ویسا ہی تھا جیسا مذکورہ انگریزی قول میں نظر آتا ہے۔

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنا کارڈ دیا تو معلوم ہوا کہ وہ احمد خلیفہ نیاس ہیں۔ وہ المعہد الاسلامی الزراعی کے پریسیڈنٹ (رئیس) تھے۔ ان کے کارڈ پر "جنرل ڈی گال اسٹریٹ" لکھا ہوا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ دکار میں فرانس کے سابق حکمراں جنرل ڈی گال کے نام سے سڑک موجود ہے۔

جنرل ڈی گال کے نام سے گالزم (Gaullism) کی اصطلاح بنی ہے۔ ڈیگال کے زمانہ میں سینیگال اور دوسرے کئی افریقی ملکوں میں فرانس کی حکومت تھی۔ تاہم آزادی کی تحریکوں نے ان مقبوضات کو فرانس کے لئے ایک بوجھ بنا دیا تھا۔ ڈی گال نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے ان ملکوں کو یک طرفہ طور پر آزاد کر دیا۔ ڈیگال کے اس عمل نے فرانس کو نئی طاقت دے دی۔ تاہم فرانس کو زندہ کرنے کا یہ کام صرف اس قیمت پر ہوا کہ اس کے بعد ڈی گال کی سیاسی موت ہو گئی۔

اکثر حالات میں قوموں کے مسائل کا حل اسی حقیقت پسندانہ تدبیر میں ہوتا ہے۔ مگر قوموں کے رہنما افراد اپنی موت پر راضی نہیں ہوتے، اس لئے وہ قوموں کو زندگی دینے میں بھی کامیاب نہیں ہوتے۔

۶ مئی ۱۹۹۰ کی سہ پہر کو افریقی بچوں کا پروگرام تھا۔ یہ بے حد موثر پروگرام تھا۔ مگر وہ چوں کہ عملی نوعیت کا تھا اس لئے اس کو لفظوں میں پوری طرح بیان نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں ایک تنظیم دائرۃ المسترشدین والمسترشدات کے نام سے قائم ہے۔ سارے ملک میں اس کے مدارس موجود ہیں جن میں لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام ہے۔ یہ طلبہ اور طالبات ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوئے۔ انھوں نے کئی بڑے اثر انگیز پروگرام کئے۔

اس پروگرام کا انتظام ڈکار کے بڑے اسٹیڈیم میں کیا گیا تھا۔ اسٹیڈیم کے ایک طرف مہمان حضرات اونچی نشستوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ درمیان میں کھلا ہوا میدان تھا۔ میدان کے دوسری طرف ہمارے سامنے دوبارہ اونچی نیچی نشستوں پر ہزاروں کی تعداد میں افریقی لڑکے اور لڑکیوں کی قطاریں تھیں۔ سفید لباس یہاں کا قومی لباس ہے۔ چنانچہ سب کے سب مکمل طور پر سفید کپڑوں میں ملبوس تھے۔ سفید کپڑوں میں لپیٹے ہوئے ان کے کالے چہرے اس طرح دکھائی دیتے تھے گویا یہ کوئی دوسری مخلوق ہے جو آسمان سے زمین پر اتر آئی ہے۔

ایک شخص سیٹی لئے ہوئے میدان کے درمیان کھڑا ہوا۔ اس کی سیٹی پر کنارہ کے گیٹ سے لڑکے اور لڑکیاں منظم ٹولیوں کی صورت میں سفید کپڑوں کے ساتھ مارچ کرتے ہوئے سامنے سے گزرنے لگے۔ باری باری ایک ایک ٹولی آرہی تھی اور مخصوص انداز میں مارچ کرتی ہوئی ایک طرف سے دوسری طرف جارہی تھی۔ ایک آدمی ماہرانہ انداز میں سیٹی بجا کر اور ہاتھ سے اشارہ کر کے ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اس طرح تقریباً ۲۰ مدرسوں کے طلبہ وطالبات گزرے۔

یہ منظر بڑا اثر انگیز تھا۔ وہ میرے لئے قیامت کے اس واقعہ کی تمثیل بن گیا جس میں کہا گیا ہے کہ وسیق الذین اتقوا ربهم الى الجنة زمرا (الزمر) ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اہل جنت کے قافلے ایک کے بعد ایک آرہے ہیں۔ اور خدا کا نمائندہ بلندی پر کھڑا ہوا ان کو جنت کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔

سینیگال (اور مغربی افریقہ کے دوسرے ملکوں) میں بعض رواج بڑے عجیب ہیں جو قدیم قبائلی دور سے چلے آرہے ہیں۔ ایک صاحب نے کہا کہ اگر آپ کسی افریقی عورت کو دیکھیں کہ اس کے سینہ کے اوپر کا حصہ کھلا ہوا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ابھی غیر شادی شدہ ہے اور اگر سینہ کے اوپر کا حصہ ڈھکا ہوا ہے تو وہ شادی شدہ ہوگی (اذا وجدت او رأيت فتاةً عاريةً من فوق صدرها فهٰذه دلالةٌ على أنّها لا تزالُ بكراً والعكس هو الصحيح)

اس جملہ میں والعکس ھو الصحیح انگریزی اسلوب (and vice versa) کا ترجمہ ہے۔ انگریزی اور فرانسیسی اسالیب اس طرح کثرت سے جدید عربی میں رائج ہوگئے ہیں۔

ایک صاحب سے ملنے کے لئے میں ان کے ہوٹل کے کمرہ میں داخل ہوا۔ ٹیلی ویژن کھلا ہوا تھا

اور وہ اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ آج ساری دنیا میں کروڑوں انسان روزانہ ٹیلی ویژن پر واقعات کی تصویریں دیکھتے ہیں اور اس کو دیکھ کر لطف اٹھاتے ہیں۔ مگر شاید ہی زمین پر کوئی انسان ہو جو ٹیلی ویژن دیکھے تو اس کو ٹیلی ویژن کے پردہ پر خود اپنا فلم دکھائی دینے لگے۔ وہ یہ سوچ کر تڑپ اٹھے کہ قیامت میں اگر خدائی ٹیلی ویژن پر میری زندگی کا ریکارڈ اسی طرح عیاں کر دیا گیا تو میرا انجام کیا ہوگا۔

ایک صاحب سے میں نے یہ بات کہی تو انھوں نے ایسا جواب دیا جس نے میری زبان کو بند کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم ان سب اندیشوں میں نہیں رہتے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہمارا راستہ سیدھا جنت کی طرف چلا جا رہا ہے۔ اصحاب رسول کو جو ایمان ملا تھا وہ تو ان کو رجا، اور خوف کے درمیان رکھتا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے ایسا اسلام دریافت کر رکھا ہے جس میں "خوف" حذف ہو گیا ہے۔ اب ان کے لئے ایمان صرف رجا، ہی رجا، ہے، اس میں خوف اور اندیشہ کا گزر نہیں۔

۸ مئی کی سہ پہر کو کانفرنس کے تمام شرکا قافلہ کی صورت میں دکار کے باہر اس مقام پر لے جائے گئے جہاں المؤتمر الاسلامی کا مرکز زیر تعمیر ہے۔ یہ عظیم مرکز سعودی عرب، کویت، لیبیا، عرب امارات، اور دوسرے عرب ممالک کے مشترک مالی تعاون سے تعمیر کیا جا رہا ہے۔

دیو پیکر مشینیں، اونچی دیواریں، بلند و بالا ستونوں کے درمیان آدمی اپنے قد کو چھوٹا محسوس کر رہا تھا۔ لوگ متحیر نگاہوں سے اس عمارتی پہاڑ کو دیکھ رہے تھے جو ان کی آنکھوں کے سامنے وسیع میدان میں ابھرتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ مادی حقیقتوں کی اس ظاہری عظمت کے سامنے کون ہوگا جو معنوی حقیقتوں کی مخفی عظمت کو محسوس کرے اور اس کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس کے آگے جھکا دے۔ یہ بھی شاید خدا کے قانون التباس (الانعام ۹) کا ایک پہلو ہے کہ اگرچہ اللہ کے نزدیک ساری عظمت اور ساری اہمیت صرف معنوی حقیقتوں کو حاصل ہے، مادی حقیقتیں اللہ کے نزدیک جناح بعوضہ (مچھر کے پر) کے برابر بھی وزن نہیں رکھتیں۔ مگر امتحان کی اس دنیا میں معاملہ کو عملاً بالکل الٹ دیا گیا ہے۔

کیسا عجیب ہے یہ امتحان، اور کیسے عجیب ہوں گے وہ لوگ جو اس امتحان میں پورے اتریں۔ یہی لوگ خدا کے قریب جگہ پائیں گے۔

۹ مئی ۱۹۹۰ کی شام کو "قصر الرئیس" میں جمہوریہ سینیگال کے صدر عبدہ ضیوف کے ساتھ اجتماعی ملاقات ہوئی۔ اس عمارت کی تصویر اس سے پہلے میں نے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں دیکھی تھی۔ اس لئے جب میں وہاں پہنچا تو مجھے اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ باہر سے وہ مجھے دیکھی ہوئی عمارت کی طرح نظر آئی۔ فرانسیسیوں کی بنائی ہوئی یہ عمارت انتہائی سادگی کے باوجود انتہائی پرشوکت ہے۔

جب میں اس "قصر" میں داخل ہوا اور اس کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا اس مخصوص ہال میں پہنچا جہاں صدر کے ساتھ ملاقات مقرر تھی تو میرا پہلا تاثر یہ تھا: اقتدار کی شان وشوکت اتنی زیادہ ہے کہ مشکل ہی سے کوئی شخص ایسا ہو سکتا ہے جو اس کو دیکھے، اس کے باوجود اس کا طالب نہ بنے۔

صدر سے ملاقات کے بعد کلچرل منسٹر کی رہائش گاہ پر ملاقات کا پروگرام تھا۔ وہاں پہنچے تو گانے کی ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ صدر کی رہائش گاہ میں مکمل سکون تھا۔ مگر کلچرل منسٹر کی رہائش گاہ میں شاید عہدہ کی رعایت سے صوتی آرٹ کا مظاہرہ کیا جارہا تھا۔ یہاں ہم نے مغرب کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی۔

یہاں جن لوگوں سے ملاقات ہوئی ان میں پاکستان اور ایران کے سفیر بھی تھے۔ میرا ارادہ ہندستان کے سفیر سے ملاقات کرنے کا تھا۔ مگر معلوم ہوا کہ ہندستان کا سفارت خانہ اس وقت بغیر سفیر ہے۔ سکنڈ سکریٹری ضروری فرائض انجام دے رہے ہیں۔

شام کا کھانا ایک لبنانی تاجر کے یہاں تھا۔ وہ لبنانی عرب ہیں اور ان کا نام فواد شقیری ہے۔ وہ یہاں امپورٹ اکسپورٹ کا بزنس کرتے ہیں۔ ان کا عالی شان مکان بتا رہا تھا کہ وہ اپنی تجارت میں نہایت کامیاب ہیں۔ آج کے کھانے پر پریسیڈنٹ مسٹر عبدہ ضیوف بھی مدعو تھے۔ مگر کسی وقتی سبب سے نہ آسکے۔ ان کی طرف سے ان کے ایک نمائندہ نے شرکت کی۔

۹ مئی کو تواون (Tivoouane) کا پروگرام تھا۔ یہاں سینیگال کے بہت بڑے شیخ عبدالعزیز سی (الخليفة العام للطائفة التيجانية) رہتے ہیں۔ وہ نہ صرف بہت ضعیف ہو چکے ہیں، بلکہ دونوں آنکھوں سے معذور بھی ہیں۔ ان کا معاملہ یہاں تقریباً وہی ہے جو سعودی عرب میں شیخ باز کا ہے۔

صبح کو ۹ بجے دکار سے تواون کے لئے قافلہ کی صورت میں روانگی ہوئی۔ سڑک نہایت عمدہ اور کشادہ تھی۔ اس کا بیشتر حصہ سمندر (البحر المحیط) کے کنارے کنارے گزرتا ہے۔ درمیان میں بعض گاؤں دکھائی دئے۔ مکانات معمولی انداز میں بنائے گئے تھے۔ پختہ تعمیرات زیادہ تر قدیم فرانسیسی طرز کی نظر آئیں۔

درمیان میں ایک تعلیمی ادارہ (دارالعلوم) دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کے بورڈ پر اس کا نام معہد الازہر للدراسات الاسلامیۃ (Tel. 511554) لکھا ہوا تھا۔ ہم لوگ اس کے اندر گئے۔ اس کے کئی درجات دیکھے۔ کلاس کی صورت اسکولوں کی مانند تھی۔ ایک طرف دیوار کالی کر کے اس کو بلیک بورڈ کی صورت دی گئی تھی۔ یہاں استاد کھڑا ہوا تھا۔ سامنے ڈسک پر طلبہ بیٹھے ہوئے تھے۔ استاد عربی زبان میں لکچر کے انداز میں انھیں پڑھا رہا تھا۔

یہ طریقہ مجھے پسند آیا۔ ہندستان میں کثرت سے عربی مدارس قائم ہیں۔ مگر ان میں ذریعہ تعلیم اردو رکھا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آدمی عربی مدرسہ سے فارغ ہو جاتا ہے مگر عربی بولنے کی صلاحیت اس کے اندر پیدا نہیں ہوتی۔

اس کے بعد ہم تواون پہنچے۔ یہاں خلیفہ الحاج عبد العزیز سی سے ملاقات ہوئی۔ یہ اندازہ ہوا کہ انھیں عوام میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہے۔ آج ان کی اپیل پر بے شمار لوگ کانفرنس کے شرکاء کے استقبال کے لئے نکل پڑے تھے۔ اس سے پہلے دکار کے اجتماع میں میں نے دیکھا کہ وہاں خلیفہ کے نمائندہ نے تقریر کی اور پریسیڈنٹ نے تقریر کی۔ مگر خلیفہ کے نمائندہ نے جب خلیفہ کا ذکر کیا تو ان کے لئے پریسیڈنٹ سے بھی زیادہ تالیاں بجائی گئیں۔

یہاں کے سیاسی لیڈر اس راز کو سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ مذہبی رہنماؤں کو بالکل نہیں چھیڑتے۔ وہ ان کا احترام کرتے ہیں۔ شاہ ایران نے اسی معاملہ میں غلطی کی اور اس کی قیمت اسے یہ دینی پڑی کہ اس کا اقتدار ایران سے ختم ہو گیا۔ شاہ ایران کو جس چیز نے ختم کیا وہ خود شاہ کے غیر حکیمانہ اقدامات تھے، اور سینیگال کے سیاسی لیڈر اس غلطی سے اپنے آپ کو مکمل طور پر بچائے ہوئے ہیں۔ تواون کا اجتماع الحاج عبد العزیز سی کی موجودگی میں ہوا۔ یہاں پریسیڈنٹ کا ایک نمائندہ بھی موجود تھا۔ اس نے ایک سے زیادہ بار یہ جملہ دہرایا: ذالك ببركة دعوات اسلافنا الكرام۔

(باقی)

ایک سبق

" اللہ تعالیٰ ہی کو مقدم کرو اور دین کو دنیا پر ترجیح دو۔ جب تک انسان اپنے اندر دنیا کا کوئی حصہ بھی پاتا ہے وہ یاد رکھے کہ ابھی وہ اس قابل نہیں کہ دین کا نام بھی لے۔ یہ ایک غلطی لوگوں کو لگی ہوئی ہے کہ دنیا کے بغیر دین حاصل نہیں ہوتا۔ انبیا علیہم السلام جب دنیا میں آئے ہیں، کیا انھوں نے دنیا کے لئے سعی اور مجاہدہ کیا ہے یا دین کے لئے؟ اور باوجود اس کے کہ ان کی ساری توجہ اور کوشش دین ہی کے لئے ہوتی ہے پھر کیا وہ دنیا میں نامراد رہے۔ کبھی نہیں۔ دنیا خود ان کے قدموں پر آکر گری۔ یہ یقیناً سمجھو کہ انھوں نے دنیا کو گویا طلاق دے دی تھی۔ لیکن یہ ایک عام قانون قدرت ہے کہ جو لوگ خدا تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں وہ دنیا کو ترک کرتے ہیں۔ اس سے یہ مراد ہے کہ وہ دنیا کو اپنا مقصود اور غایت نہیں ٹھہراتے۔ اور دنیا ان کی خادم اور غلام ہو جاتی ہے۔ جو لوگ برخلاف اس کے دنیا کو اپنا اصل مقصود ٹھہراتے ہیں خواہ وہ دنیا کو کسی قدر بھی حاصل کرلیں مگر آخر ذلیل ہوتے ہیں۔ سچی خوشی اور اطمینان اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے عطا ہوتا ہے۔ یہ مجرد دنیا کے حصول پر منحصر نہیں ہے۔" (ملفوظات جلد ہفتم صفحہ ۳۱۶ - ۳۱۷)

اوپر جو عبارت نقل کی گئی، وہ ایک اقتباس ہے۔ اس کو پڑھئے۔ بظاہر یہ کسی مسلمان بزرگ کا کلام معلوم ہوتا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ در اصل مرزا غلام احمد قادیانی کا ملفوظ ہے جو قادیان کے ہفت روزہ بدر (۳۱ مئی ۱۹۹۰) کے صفحہ اول پر چھپا ہے۔

مرزا غلام احمد قادیانی کو تمام مسلم علما نے متفقہ طور پر کافر قرار دیا ہے۔ اس کے باوجود ان کے " ملفوظات " میں ایسی باتیں ملتی ہیں جن کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کہ وہ کسی سچے بزرگ کا کلام ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صرف اچھا کلام اس بات کا ثبوت نہیں کہ اس کو کہنے والا اچھا انسان یا صحیح انسان بھی ضرور ہے۔ کسی انسان کو سمجھنے کے لئے اس کے پورے کلام اور اس کی پوری زندگی کو دیکھنا چاہئے نہ کہ صرف جزئی کلام یا جزئی زندگی کو۔ کسی انسان کے بارہ میں حکم لگانے کے لئے اس کی تقریر یا تحریر کا صرف ایک اقتباس کافی نہیں۔

برصغیر ہند میں مغل سلطنت کا خاتمہ اور وسیع تر عالم اسلام میں خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد ساری دنیا میں احیاء کی تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان تحریکوں کا مشترک فکر یہ تھا کہ "اسلام کا اقدامی عمل جہاد ہے۔" یہ حالت سو سال سے زیادہ عرصہ تک جاری رہی۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۶ میں الرسالہ جاری ہوا۔ اس نے پہلی بار یہ آواز بلند کی کہ "اسلام کا اقدامی عمل دعوت ہے۔" اس وقت یہ ایک تنہا آواز تھی۔ آج اللہ کے فضل سے ساری دنیا میں لاکھوں آدمی اس پیغام کی اہمیت کو سمجھ چکے ہیں۔ بہت جلد انشاء اللہ وہ وقت آنے والا ہے جبکہ یہی دعوتی فکر سارے عالم اسلام کا غالب فکر بن جائے۔

۲ پچھلے ۵۰ سال سے ہندستانی مسلمانوں کو ایک ہی بات بتائی جا رہی تھی۔ یہ کہ تمہاری ہر محرومی دوسروں کے زیادتی اور تعصب کا نتیجہ ہے۔ الرسالہ نے پہلی بار بتانا شروع کیا کہ یہ زندگی کی حقیقت ہے نہ کہ تعصب۔ اور محنت اور تدبیر کے ذریعہ اس پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اب وہ لوگ بھی اس واقعہ کا اعتراف کرنے لگے ہیں جو دوسروں کے ظلم و تعصب کے اعلان کے چمپئن بنے ہوئے تھے۔ مثلاً مسٹر شہاب الدین اپنے روایتی فکر کو دہراتے ہوئے اب یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ——— مگر محرومی زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ صرف ہندستانی مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ ۸۵ فی صد عوام کے لئے بھی۔ اور صرف تعلیم میں نہیں بلکہ انسانی سرگرمیوں کے ہر میدان میں۔ اس لئے محدود مواقع میں مقابلہ کی صورت حال کے اندر مراعات یافتہ مفادات اور غالب طبقوں کے خلاف ایک مستقل چوکسی اور مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہے:

But deprivation is a fact of life and not only for Muslim Indians but for 85% of our people not only in education but in every field of human activity. So a constant vigil and a ceaseless struggle are called for in a situation of competition for scarce resources against vested interests and dominant groups. *Muslim India*, July 1990, p. 294.

۳ الرسالہ کا فکر خدا کے فضل سے اب اتنا غالب آچکا ہے کہ تقریباً تمام لوگ کسی نہ کسی طور پر اب اسی کو دہرا رہے ہیں۔ تاہم اعتراف کی جرأت نہ ہونے کی وجہ سے وہ الرسالہ کی بات کو اپنی بات بنا کر پیش کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ماہنامہ ریاض الجنۃ (مئی ۱۹۹۰) کا اداریہ

(عصر حاضر کا تقاضا) پورا کا پورا الرسالہ کی نقل ہے۔ صرف معمولی طور پر کچھ الفاظ بدل دئے گئے ہیں۔ یہ بات اگر اپنی غلطی کے اعتراف کے ساتھ کی جائے تو زیادہ موثر ہو۔

۴ جناب شکیل احمد خلیل صاحب (ابوظبی) الرسالہ مشن سے گہرا شغف رکھتے ہیں۔ وہ تقریباً ہر ماہ مختلف اسلامی اداروں، دینی درس گاہوں اور اردو لائبریریوں کے نام ماہانہ الرسالہ جاری کرواتے ہیں اسی کے ساتھ الرسالہ کیسٹ اور مرکز کی دوسری مطبوعات بھی ایک قابل لحاظ تعداد میں، بطور ہدیہ ارسال کرواتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ مزید کچھ افراد اس قسم کے حوصلہ مندانہ تعاون کے لئے آگے بڑھیں تاکہ الرسالہ کا دعوتی اور تعمیری مشن زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر پھیل سکے۔

۵ اسلامک سنٹر آف نارتھ امریکا (I.C.N.A) کے زیر اہتمام نیویارک میں بتاریخ ۲۰ تا ۲۲ جولائی ۱۹۹۰ ایک سہ روزہ کنونشن منعقد ہوا۔ اس موقع پر امریکا میں ہمارے مخلص معاون جناب خواجہ کلیم الدین صاحب اور ان کے رفقاء نے اسلامی مرکز کی مطبوعات کا اسٹال لگایا۔ جس کو حیرت انگیز کامیابی ملی۔ کافی بڑی تعداد میں لوگوں نے نہایت ذوق و شوق اور دلچسپی کے ساتھ کتابوں کا مشاہدہ کیا۔ اس طرح خدا کے فضل سے ایک نئے حلقہ میں الرسالہ اور مرکز کی دیگر مطبوعات کا تعارف ہو گیا۔

۶ اسلامی مرکز کی مطبوعات ہدیۃً ارسال کرنے کے لیے ہمیں دینی درسگاہوں، اردو لائبریریوں، اسکولوں اور کالجوں کے پتے مطلوب ہیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ اپنے علاقے میں واقع دینی مدارس اور دوسرے علمی اداروں کے پتے مختصر تعارف کے ساتھ ارسال فرمائیں۔ اگر اداروں کے ذمہ دار حضرات کو اس پہلو پر توجہ دلا کر ان کا مطبوعہ تعارف نامہ روانہ کریں تو زیادہ بہتر ہوگا۔

۷ پاکستان کا مشہور اخبار "وفاق" ہر روز اپنے صفحہ ۳ پر الرسالہ کا کوئی ایک مضمون نقل کرتا ہے۔ اس کے اداریتی نوٹس میں بھی الرسالہ کے فکر کی جھلک آنے لگی ہے۔ مثلاً اس کے شمارہ ۱۳ جون ۱۹۹۰ میں ایک نوٹ کا عنوان ہے: "مسائل امن کی قوت سے حل کیجئے"۔ اس نوٹ میں پاکستانی حکمرانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ پڑوسی ملک سے ہمارے جو مسائل ہیں

ان کو ہمیں جنگ کی قوت سے نہیں بلکہ امن کی قوت سے حل کرنا چاہئے۔ یہ واضح طور پر الرسالہ کے فکر کی تاثیر کی ایک مثال ہے۔

۸ جوہانسبرگ (افریقہ) کے انگریزی ماہنامہ البلاغ نے اپنے صفحات میں الرسالہ انگریزی کے مضامین نقل کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس کے ایڈیٹر نے اپنے خط (۲۱ جولائی ۱۹۹۰) میں لکھا ہے:

I have taken the liberty of reproducing an article in the current issue of *Al-Balagh*, and wish to do so in future also, with your kind permission, for da'wah work. Your articles are short, concise, succinct and to the point. They are eye-openers and I, for one, enjoy reading them immensely. Every article, including the titbits, are highly educative and enlightening. (A.S.K. Joommal)

۹ سرینگر کا اخبار "روشنی" کشمیر کے جنگجوؤں اور دہشت گردوں کی باتیں مسلسل چھاپتا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ الرسالہ کے وہ مضامین بھی تقریباً ہر شمارہ میں چھاپ رہا ہے جن میں امن اور تعمیر اور انسانیت کا پیغام ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ نام نہاد اسلام پسندوں کی چھیڑی ہوئی تخریبی سیاست کے ساتھ الرسالہ کا تعمیری فکر کس طرح متوازی طاقت بن کر ابھر رہا ہے۔

۱۰ جناب مہدی حسن صاحب (بنارس) نے ۲۰ جون ۱۹۹۰ کی ملاقات میں بتایا کہ پروفیسر نور محمد بنارسی امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں قانون کے استاد ہیں۔ ان کی یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک اجتماع ہوا۔ اس میں غیر مسلم حضرات بھی شریک تھے۔ ایک غیر مسلم پروفیسر نے کہا "یہ بتائیے کہ آپ کے اسلام میں وہ کون سی تعلیم ہے جو موجودہ حالات میں سب سے زیادہ قابل عمل اور ریلیونٹ ہے۔ ایک مسلمان پروفیسر نے کہا کہ "صلح حدیبیہ کا اصول ایک ایسا اصول ہے جو آج کے حالات میں سب سے زیادہ قابل عمل اور ریلیونٹ ہے۔" غیر مسلم حضرات نے اس جواب کو بہت پسند کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ الرسالہ کا طرز فکر کس طرح عالمی سطح پر پھیل رہا ہے۔

۱۱ تذکیر القرآن کا عربی ترجمہ پہلے سے کیا جا رہا تھا۔ اب اس کا انگریزی ترجمہ بھی شروع کر دیا گیا ہے۔

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے۔ جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے۔ جو کارِ نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔ ۱۰۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط وکتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زرِ تعاون الرسالہ

قیمت فی شمارہ	۵ روپیہ
زر تعاون سالانہ	۶۰ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۳۰۰ روپیہ
بیرونی ممالک کے لیے	
ہوائی ڈاک (سالانہ)	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک (سالانہ)	۱۵ ڈالر امریکی
خصوصی تعاون سالانہ	۱۰۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

ISLAM

In Contemporary Language

AL-RISALA monthly has a two-fold aim: first, to introduce Islam as a divine message; second, to promote positive and constructive thinking among the people. It is published in Urdu and English by the Islamic Centre, New Delhi.

To receive your copies of this thought-provoking magazine regularly, subscribe NOW.



Ask for a free sample copy.

Please send AL-RISALA to me/my friend/relative at the following address:

Name: ______________________

Address: ______________________

____

____

Please send a free sample copy of AL-RISALA at the following address:

____

____

____

(Please use a separate sheet for more than one address)

☐ Please send a publications catalogue

Please tick box where applicable

☐ Urdu ☐ 1 year ☐ 3 years
☐ English ☐ 2 years ☐ 5 years
☐ Air-mail ☐ Surface-mail

I am enclosing Cheques/Bank Draft/ Postal Order/M.O. Receipt No. ______

Subscription Rates

INLAND	ABROAD AIRMAIL	ABROAD SURFACE MAIL
1 year Rs 60	Rs 400/$25/£15	Rs 200/$15/£8
2 years Rs 110	Rs 700/$45/£25	Rs 350/$25/£15
3 years Rs 150	Rs 1000/$65/£40	Rs 500/$35/£20
5 years Rs 240	Rs 1500/$100/£60	Rs 750/$55/£30

Pakistan Rs 150 for one year

Supporting Subscription (For One Year)

INLAND .... Rs 300

ABROAD (By Air-mail) .... $100/£60

Please send this together with the payment to the Circulation Manager.

AL-RISALA The Islamic Centre, C-29 Nizamuddin West, New Delhi 110 013 (India)

RNI 28822/76 □ October 1990 No. 167 □ Rs. 5

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن جلد اول	Rs 150/-
" " جلد دوم	150/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	35/-
مذہب اور جدید چیلنج	40/-
عظمت قرآن	25/-
دین کامل	45/-
الاسلام	35/-
ظہور اسلام	35/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	20/-
راز حیات (مجلد)	55/-
صراط مستقیم	35/-
خاتون اسلام	40/-
سوشلزم اور اسلام	35/-
اسلام اور عصر حاضر	25/-
حقیقت حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دور جدید کا خالق	20/-
رشدیات	
تعمیر کی طرف	8/-
راہ عمل	
تبلیغی تحریک	20/-
میوات کا سفر	30/-
اقوال حکمت	20/-
تعبیر کی غلطی	45/-

دین کی سیاسی تعبیر	15/-
دین کیا ہے	4/-
قرآن کا مطلوب انسان	10/-
تجدید دین	
اسلام دین فطرت	5/-
تعمیر ملت	5/-
تاریخ کا سبق	5/-
مذہب اور سائنس	
عقلیات اسلام	
فسادات کا مسئلہ	4/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	5/-
ایمانی طاقت	5/-
اتحاد ملت	5/-
سبق آموز واقعات	5/-
زلزلۂ قیامت	7/-
حقیقت کی تلاش	5/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	5/-
اسلامی دعوت	5/-
خدا اور انسان	5/-
حل یہاں ہے	8/-
سچا راستہ	4/-
دینی تعلیم	5/-

حیات طیبہ	5/-
باغ جنت	5/-
نار جہنم	5/-

الرسالہ کیسٹ

نمبر ۱ ایمان	25/-
نمبر ۲ جدید امکانات	25/-
نمبر ۳ اسلامی اخلاق	25/-
نمبر ۴ اتحاد	25/-
نمبر ۵ تعمیر ملت	25/-
نمبر ۶ سنت رسولؐ	25/-
نمبر ۷ میدان عمل	25/-
نمبر ۸ پیغمبر [illegible]	25/-
الرسالہ مجلد فی جلد	75/-

God Arises	Rs 60/-
Muhammad The Prophet of Revolution	65/-
Religion and Science	30/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	5/-
The Teachings of Islam	6/-
The Good Life	6/-
The Garden of Paradise	6/-
The Fire of Hell	6/-
Muhammad The Ideal Character	5/-
Man Know Thyself!	5/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳